مستنصر حسین تارڑ
سیاہ آنکھ میں تصویر

آدھی رات کا سورج

"برائے فروخت۔ اعلیٰ پیڈگری کے السیشن پِلّے۔ خاصے پلے ہوئے۔ معزز گھرانے میں پروردہ۔ صرف کتّوں سے بے پناہ پیار کرنے والے باذوق حضرات رجوع فرمائیں۔ قیمت پانچ سو روپے فی پلّا۔ فون......"

"بہت خوب......" میں نے جماہی لیتے ہوئے کروٹ بدلی۔ میری بیوی ابھی تک لحاف سے منہ ڈھانپے سو رہی تھی۔

"بیگم......" میں نے اخبار تہ کر کے اپنے لحاف پر رکھ دیا۔ "کیا خیال ہے ایک عدد السیشن پلّا نہ خرید لیا جائے......گھر میں رونق رہے گی۔"

"ہوں......" درونِ لحاف سرگوشی ہوئی۔

"میں کہہ رہا تھا ایک السیشن پلّا خرید لیں گھر میں رونق......"

"پِلّا!" بیگم نے اپنے سر سے لحاف اُتار پھینکا اور یوں اُٹھ بیٹھی جیسے غروبِ آفتاب کے وقت روایتی کاؤنٹ ڈریکولا اپنے تابوت میں سے اُٹھ بیٹھتا ہے۔ بیگم کی آنکھیں سُرخ ہو

ہی تھیں۔" اس کال کوٹھڑی میں میرے جہیز کا سامان تو پورا نہیں آتا۔ پلا کہاں رکھو گے۔"
"نیچے سیڑھیوں میں باندھ دیں گے۔"
"مہترانی ہر روز سیڑھیوں کے بلب اُتار کر لے جاتی ہے پلا کہاں چھوڑے گی؟"
"یہ تو ہے۔" میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔" بہرحال اپنا مکان بنائیں گے نا تو پھر لے آئیں گے۔"

"اپنا مکان......" بیگم نے اپنے بھاری پپوٹے یوں جھپاک سے اُوپر اُٹھا دیئے جیسے اُن میں گیس بھر گئی ہو۔" خاک اپنا مکان تین سال ہونے کو ہیں اپنی شادی کو اور تب سے مجھے اس موئے کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ یاد ہے جب تک بات پکی ہو رہی تھی تو تمہارے گھر والوں نے کہا تھا کہ بس آپ کی بیٹی کی ڈولی تو ہمارے نئے گھر میں اُترے گی......"
"بھئی وہ کاروباری حالات......" خواہ مخواہ پلے کا ذکر چھیڑ کے پلا گلے میں ڈال لی تھی۔
"لیکن تمہارے گھر والوں نے......"
"دیکھو نا بیگم" میں نے قدرے نرمی سے کہا۔" بات پکی کرتے وقت فریقین کے درمیان جو بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں وہ درست ہوں تو پھر اُن کی رُو سے ہر لڑکی کے حصے میں ایک عدد شہزادہ آئے اور ہر لڑکا کوہ قاف کی پری سے شادی رچائے......"
"کیا ہے جی میری شکل وصورت کو......" بیگم کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔
میں نے جواب دینا مناسب نہ جانا اور بڑی ڈھٹائی سے اخبار پھر اپنے آگے پھیلا کر" برائے فروخت" کے اشتہاروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔
"بانگو ڈرمز۔ اے وَن کنڈیشن......موسیقی کے شائقین کے لیے نادر موقع......"
جدید طرز کا نو تعمیر کردہ گھر۔ دس بیڈ روم، ملحقہ باتھ رومز......چار گیراج......
مینٹل ہاسپٹل کے نزدیک......

"مینٹل ہاسپٹل؟" میں نے کن انکھیوں سے بیگم کی جانب نگاہ کی۔ وہ پھر اُونگھ رہی تھی۔
آج اتوار تھا اور میں حسب عادت" پچھلے کئی برسوں کی روٹین پر بڑی باقاعدگی سے عمل کر رہا تھا۔ آئی۔ بی۔ ایم کے کسی کمپیوٹر کی مانند اتوار کو میرا ہر عمل بے حد نپا تُلا ہوتا میری

تفریح کا واحد دن۔ صبح سات بجے اُٹھ کر فلیٹ کی پوری باون سیڑھیاں اُتر کر نیچے ڈیوڑھی میں سے اخبار لانا اور پھر بستر میں لیٹ کر سب سے پہلے" برائے فروخت" کا کالم پڑھنا، اس کے بعد فلمی اشتہاروں کا صفحہ اور پھر چھوٹی چھوٹی خبریں۔ اداریہ چونکہ ایک عرصے سے خوش آمدید اور خیر مقدم کہنے کے لیے مخصوص ہیں اس لیے آجکل برائے فروخت اور فلمی اشتہاروں کا صفحہ ہی پورے اخبار میں او ریجنل ہوتے ہیں۔ اخبار کی ورق گردانی کے بعد ناشتے کے لیے بیگم کی منتیں۔ پھر کافی کی چسکیوں کے ساتھ اخبار کے سنڈے ایڈیشن کا بغور مطالعہ کہ شاید اپنا بھی کہیں ذکر ہو جسمانی اور رُوحانی غذا کے چٹخارے کے بعد ننھے سلجوق کو حسب معمول چڑیا گھر دکھانا اور چڑیا گھر میں حسب معمول بیگم کے طعنے سننا کہ ہمارے گھر سے تو اِن موئے بن مانسوں کے نئے تعمیر کردہ پنجرے ہی بہتر ہیں۔ اب بیگم کو کون سمجھاتے کہ بن مانسوں میں شادی کا رواج نہیں ہوتا۔ بہرحال چڑیا گھر کی سیر کے بعد بیگم کو ڈمپ کرنا اور رُخ وائی ایم سی اے کی جانب کرنا جہاں کسی ادبی محفل میں شامل ہو کر خود ساختہ انقلابی حضرات کی تقاریر سُننا۔ یہ تھا میری چھٹی کے اکلوتے دن اتوار کا کمپیوٹرائزڈ مصرف۔
"برائے فروخت" کا کالم ختم ہُوا تو میں دوسرے صفحے پر فلمی اشتہاروں سے آنکھیں سینکنے لگا۔" یہ پاگل پاگل دنیا۔" میں نے پھر بیگم کی جانب نگاہ کی جواب اُونگھنے کی بجائے منہ کھولے گہری نیند سو رہی تھی۔
تیسرے صفحے پر" آج لاہور میں" کا کالم تھا۔ انجمن فلاح و بہبود رحمان گلی کا ماہانہ اجلاس۔ انٹرکان میں لاوارث بچوں کی امداد کے لیے چیریٹی بال حلقۂ ارباب ذوق کا اجلاس......وغیرہ۔"
"آج لاہور میں" کے پہلو میں مختصر خبروں کا بھی ایک کالم تھا۔" کمال دین ریلوے مزدور رلو کو شیڈ میں شراب کے نشے میں غل غپاڑہ مچاتے ہوئے گرفتار۔"
کراچی جمخانہ کے سالانہ ڈنر میں کمشنر جناب فلاں نے پاکستان کی سلامتی کا جام تجویز کرتے ہوئے کہا......"
"گوالمنڈی میں تین جوئے باز دھر لیے گئے۔ جوئے کی رقم مبلغ سات روپے تیس پیسے برآمد......"

لیڈیز کلب میں تمبولا...... پہلا انعام دو ہزار روپے......

اور آخر میں کھٹمنڈو (نیپال) کل ایک مسافر بس جب دہلی سے یہاں پہنچی تو اگلی نشست پر ایک نوے سالہ فرانسیسی سیاح مُردہ حالت میں پایا گیا۔ حکومت نے سیاح کے سفری کاغذات میں سے برآمد ہونے والی وصیت کے مطابق اُس کی لاش واپس فرانس بھیجنے کی بجائے نیپال میں ہی دفن کر دی ہے۔ رینے کلاڈ ماہر تعمیرات تھا۔"

"رینے کلاڈ؟ میں نے اخبار اپنے چہرے سے نیچا کیا۔ میری نظروں کے سامنے تانبے کے پتلے فریم کی عینک لگائے، رعشہ زدہ ہاتھوں میں کیمرہ تھامے، ایک ٹانگ سے قدرے لنگڑاتا ہوا ایک عمر رسیدہ بوڑھا کھڑا اپنے نقلی دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔

"میرا نام رینے کلاڈ ہے۔"

چند ماہ پیشتر میرا چھوٹا بھائی مُبشر کابل گیا۔ لاہور واپسی پر جہاں وہ کوہ ہندو کش کی ہیبت ناک خوبصورتی اور افغانی پوستینوں کا ذکر کرتا وہاں اپنے فرانسیسی دوست کا تذکرہ بھی بڑی عقیدت سے کرتا۔ "بھائی جان وہ میرا دوست نہ بنتا تو میں کابل کی تاریخی اہمیت اور وہاں کے عجائب گھر میں رکھے ہوئے نوادرات کی اہمیت سے کبھی آگاہ نہ ہوتا۔ ہے تو بڑی بڈھ قسم کی شے مگر دلچسپ شخصیت ہے۔ پچھلے دو ماہ سے کابل میں مقیم ہے۔ چھ سات لوہے کے بڑے بڑے ٹرنک ساتھ لیے پھرتا ہے۔ ایک میں تاریخ کی کتابیں۔ دوسرے میں کیمرے اور نقشے۔ تیسرے میں مختلف ملکوں سے خریدے ہوئے مجسمے اور پُرانی گھڑیاں...... پچھلے دو سال سے سیاحت پر نکلا ہُوا ہے، ہر تاریخی شہر میں مہینوں پڑا رہتا ہے۔ کہتا تھا جس روز بھی کابل کے بازاروں میں چہرے جانے پہچانے لگنے لگے اُسی روز بوریا بستر لپیٹ کر پاکستان کی راہ لوں گا کہتا تھا کہ لاہور آؤں گا تو تم سے ملوں گا۔ میں نے اُسے دکان کا فون نمبر دے دیا تھا۔"

اور پھر مبشر کو پاک فوج میں کمیشن مل گیا اور وہ اپنی ٹریننگ کے لیے کاکول چلا گیا۔ میں حسبِ معمول سارا دن دکان پر بیٹھ کر گاہکوں کو موسمی سبزیوں اور پھولوں کے بیجوں کے بارے میں رٹے رٹائے جملے دہرا کر روزی کماتا۔ شام کو گھر واپس آکر ٹیلیویژن دیکھتا اور

سو رہتا۔ بیچ میں ایک اتوار بھی آجاتا۔ سنڈے ایڈیشن کا مطالعہ۔ ننھے کو چڑیا گھر دکھانا وغیرہ یعنی میں ایک مکمل نارمل پاکستانی...... شادی شدہ پاکستانی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ شاید لفظ خوش و خرم اسی قسم کی زندگی کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ پھر ایک روز جب میں دکان پر بیٹھا پانی، بجلی اور ٹیلیفون، سوئی گیس، پروفیشنل ٹیکس وغیرہ کے متعدد بل سامنے رکھے سوچ رہا تھا کہ اس مرتبہ مشرقی پاکستان کی مارکٹ ختم ہو جانے سے اتنے سارے بل کیسے ادا کروں گا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہاں جی...... کون ہے؟" میں نے چونکنے میں چیخ کر دریافت کیا۔ گوالمنڈی کے علاقے میں فون پر چیخ کر بات نہ کی جائے تو آپ کی آواز پر چھابڑی والے، میوے اٹھیاتی پااور ریڑھیوں کے ڈکرانے کی آواز حاوی ہو جاتی ہے۔ چیخنے پر یہ شور بیک گراؤنڈ میوزک میں بدل جاتا ہے۔

"آلو! ...... مے آئی سپیک ٹو موباشیر پلیز!" اُدھر سے فرانسیسی لہجے کی انگریزی برآمد ہوئی۔

"موباشیر اپنی ٹریننگ کے سلسلے میں لاہور سے باہر گیا ہوا ہے۔ کون بول رہا ہے؟"

"میرا نام رین کلاڈ ہے اور میں مبشر کا دوست ہوں۔ ہم دونوں کابل میں تھے...... کیا وہ دو ایک روز تک لاہور واپس آجائے گا؟"

رین کلاڈ؟ میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی۔ آہا وہی بڈھ قسم کی شے...... مجھے یاد آگیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ وہ تو اب اپنی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد ہی لاہور واپس آئے گا...... تقریباً ایک سال بعد......"

"اوہ...... !" لہجے میں شدید مایوسی تھی۔ "تھینک یو اینڈ......"

"دیکھئے" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اُس کا بڑا بھائی ہوں، شاید آپ کسی وقت مجھ سے ملنا پسند کریں۔"

"ضرور...... ضرور۔ میں آج لاہور کا عجائب گھر دیکھنے جا رہا ہوں۔ اگر آپ دوپہر کو وہاں آجائیں تو ہم اکٹھے عجائب گھر دیکھ لیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ عجائب گھر کے پہلو میں "کِم" نام کا ایک کافی بار ہے۔ میں وہیں بیٹھ کر آپ کا انتظار کروں گا...... خدا حافظ!"

وقت مقررہ پر جب میں کِم کافی بار میں داخل ہوا تو نیم تاریک کافی بار کے ایک کونے میں نیشنل کالج آف آرٹس کا ایک جوڑا سر جوڑے آرٹ کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے تھے۔ دوسرے کونے میں ایک بگلا میز پر پھیلے ہوئے لاہور کے نقشے پر جھکا تھا۔ "یہی ہو سکتا ہے،" میں نے سوچا۔

"رینے کلاڈ؟" میں نے قریب جا کر بگلے سر سے کہا۔

اس نے بڑے آرام سے نقشہ لپیٹا، اپنی آنکھوں پر چپکی تانبے کے فریم کی عینک درست کی اور سر ہلا دیا۔

"میں بشر کا بھائی ہوں" میں نے نہایت انکساری سے کہا۔

"اوہ، ہیلو ہیلو" اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے کر دیا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

"پلیز آپ بیٹھئے......" میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ واقعی خاصی بڈھ قسم کی شے تھی۔ سفید بال، جھریوں سے بھرپور چہرہ، رعشہ زدہ ہاتھ، چیک شرٹ اور گرے پتلون میں ملبوس وہ سیاح کی بجائے مُردے دفن کرنے والی کسی یہودی کمپنی کا ڈائریکٹر لگتا تھا۔

"کِم" کا سابقہ ایسٹ پاکستانی، حال مسلم بنگالی اور آنے والی کل کا بنگلہ دیشی ویٹر میرے سر پر کھڑا آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔

"آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟" میں نے رینے سے دریافت کیا۔

"حلیم اور نان"

"حلیم......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میں تو جب سے لاہور آیا ہوں۔ روزانہ اسٹیشن کے سامنے زمین پر بیٹھ کر حلیم اور نان کھاتا ہوں۔ نہایت اوریجنل ڈش ہے۔ بے حد مزیدار......" اس نے چٹخارے لیتے ہوئے بتایا۔

ظاہر ہے ایسا جدید کافی بار اپنے مینو پر حلیم جیسی دیسی شے درج کر کے اپنا امیج تو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے معذوری ظاہر کی۔ "حلیم تو شاید یہاں نہ مل سکے......

برگر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"برگر تو میں پچھلے نوّے سال سے کھا رہا ہوں" وہ منہ کھول کر خوش دلی سے ہنس دیا۔ دانتوں کی بتیسی بھی نقلی تھی۔ "بہرحال ایک اور سہی"

میں نے اپنے لیے کلب سینڈوچ کا آرڈر دیا۔

"آپ کو پاکستان پسند آیا؟" میں نے گفتگو شروع کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"مجھے سبھی ملک پسند ہیں......" اُس نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "پاکستان بھی پسند ہے"

عجب بوڑھا ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں دکان پر ہی بیٹھا رہتا۔ دو چار روپے کی سیل تو ہو ہی جاتی۔

"لاہور میں آپ نے کیا کیا دیکھا؟" میں نے دوبارہ ہمت کی۔

"کل"؟ اس نے اپنا بگلا سر کھجایا۔ "صبح تو شالیمار گیا اور وہاں تصویریں بنائیں۔ پچھلے پہر واپس ہوٹل میں آ کر لاہور کے بارے میں تاریخ کی ایک کتاب پڑھتا رہا"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اب تک صرف شالیمار باغ دیکھا ہے؟"

"نہیں......" اس نے میز پر رکھا کانٹا اُٹھا کر اپنی گردن کے بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا۔ "اس سے پیشتر پورے تین دن میں نے اندرون شہر لکڑی کے منقش دروازوں کے نقش و نگار کے سکیچ بنانے میں صرف کئے۔ پرانے شہر میں واقع اکثر مکانوں کی بالکونیاں اور دروازے صناعی کے بہترین شاہکار ہیں......"

"گویا آپ کو تاریخی عمارات سے بیحد دلچسپی ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"عمارتوں میں میری دلچسپی قدرتی ہے" اس نے اپنا بگلا سر ہلاتے ہوئے کہا یا شاید میں نے نوٹ نہ کیا ہو۔ اُس کا سر رعشہ کی وجہ سے ویسے ہی ہل رہا تھا۔ "ریٹائر ہونے سے قبل...... اور یہ بھی تقریباً تیس برس پہلے کی بات ہے" اس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں پیرس میں ماہر تعمیرات کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ہمارے ہاں کے جدید معاشرے میں یہ فن بھی میکانکی سا ہو گیا ہے......" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کی نگاہیں دوسرے کونے

میں بیٹھے نیشنل کالج آف آرٹس کے جوڑے پر لگی تھیں۔ اُن کے سر خطرناک حد تک ایک دوسرے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ "مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مشرق میں کورٹ شپ کا رواج نہیں۔" اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"طالبِ علم ہیں......" میں نے تھوڑی کھجا کر جلدی سے کہا۔ "شاید مسئلۂ طلب پر گفتگو ہو رہی ہو، بہن بھائی بھی تو ہو سکتے ہیں۔ بہر حال ریٹائر ہونے کے بعد آپ کا کیا شغل رہا؟"

"ہاں......" اس کا سر یقیناً خود بخود ہل رہا تھا۔ "ریٹائر ہو کر کچھ عرصہ تو میں پیرس میں اپنے فلیٹ میں مقیم رہا اور پھر میری بیٹی........ میری اکلوتی بیٹی مجھے گرینوبل لے گئی جہاں وہ اور اس کا خاوند مقامی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ پانچ سال تک میں اُن کے ہاں رہا اور پھر ایک روز ڈنر کے بعد اُس نے مجھے نہایت اعلیٰ قسم کی کونی ایک کا گلاس ہاتھ میں تھمایا اور بولی۔ ڈیڈی! کچھ عرصہ سے مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم دونوں اپنی بے پناہ مصروفیات کی بناء پر آپ کا اتنا خیال نہیں رکھ رہے جتنا عمر کے اس حصّے میں رکھنا چاہیئے۔ یہاں سے صرف پچاس میل کے فاصلے پر ایک اولڈ پیپل ہوم ہے۔ نہایت ہی آرامدہ اور فضا۔ وہاں آپ کی عمر کے اور بہت سارے دلچسپ لوگ ہوں گے اور پھر وہاں کا سٹاف آپ کی دیکھ بھال نہایت مناسب طریقے سے کرے گا۔ کیا خیال ہے ڈیڈی؟" مجھے معلوم تھا، وہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے، اس کی بڑی لڑکی اب جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھی اور اُسے گھر میں ایک علیحدہ کمرے کی ضرورت تھی...... وہی ایک فالتو کمرہ جس میں مَیں مقیم تھا۔ میں آپ کو بور تو نہیں کر رہا؟"

"جی!" میں نے چونک کر کہا۔ درا صل میں دوسرے کونے میں بیٹھے جوڑے کی حرکات میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ "جی نہیں۔ بالکل نہیں......"

"اولڈ پیپل ہوم میں مجھے زندگی کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ سنٹرل ہیٹنگ، ٹیبل ٹینس، لائبریری، وقت مقررہ پر ناشتہ، لنچ اور ڈنر۔ نزدیکی ندی پر مچھلی کا شکار کرنے کے لیے ایک خوبصورت کاٹیج...... لیکن وہاں کا ماحول......" رینے کلاڈ نے میز پر سے پانی کا گلاس

اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ "آپ تو شاید کبھی کسی اولڈ پیپل ہوم میں نہیں گئے ہوں گے۔ صاف ستھری اور خوبصورت عمارت، جہاں میری طرح کے سینکڑوں بوڑھے زندگی کے آخری ایّام کاٹنے کے لیے کچھ آ جاتے ہیں اور اکثر بھیج دیئے جاتے ہیں۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم سب مر چکے ہیں اور وہ عمارت ہمارا مشترکہ تابوت ہے۔ ہر دوچار ماہ بعد ہم میں سے کوئی ایک اس مشترکہ تابوت سے نکل کر اپنے ذاتی تابوت میں جا لیٹتا...... اور جب تک ہم رات کے کھانے کے بعد آتشدان کے سامنے بیٹھ کر مرحوم کے خصائل کا ذکر کرتے اتنے عرصہ میں کوئی اور ملکِ عدم کی راہ لیتا...... اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا...... اولڈ پیپل ہوم میں قیام کی طوالت بزرگی کی علامت تھی۔ کوئی نیا رنگروٹ آتا تو یوں تعارف ہوتا...... فی لپ دس سال...... مشیل۔ تیرہ سال...... کلاڈ۔ اٹھارہ سال۔ میری بیٹی شروع میں تو ہر ماہ مجھے ملنے آ جاتی مگر آہستہ آہستہ یہ وقفہ پھیلتا گیا اور پھر آخر میں یہ ملاقات کرسمس کارڈ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس تابوت میں بیس برس زندگی گزارنے کے بعد میں نے ایک روز وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا......" رینے کلاڈ کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "میں نے ہوم کی لائبریری میں سے دنیا بھر کے نقشے اور سفرنامے کھنگال ڈالے اور اس طرح اپنے سفر کے روٹ کا تعین کیا۔ پیرس میں میرا فلیٹ عرصے سے خالی پڑا تھا میں نے اُسے فروخت کیا اور پھر وہاں سے بھاگ نکلا!"

اتنی دیر میں ویٹر ہمارا آرڈر لے آیا۔ رینے کلاڈ برگر کو چھری سے کاٹنے لگا تو ہاتھوں میں رعشے کی وجہ سے اس کی چھری بار بار سخت قیمے پر سے پھسل جاتی۔ "دولائیے میں،" میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ کی نوک قیمے میں چبھو کر اُسے کاٹ لیا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟" اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آلو کا ایک قتلہ منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی!" میں نے بوکھلا کر کہا۔ درا صل نیشنل کالج آف آرٹس کے اُس لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر لڑکی کو چوم لیا تھا۔ "اوہ ہاں! آپ وہاں سے بھاگ نکلے۔"

"ہاں!" اُس نے شہادت کی اُنگلی اُوپر اُٹھا کر کہا ——— "میں نے پیرس میں اپنا فلیٹ فروخت کیا اور اپنی بیٹی کو اطلاع دیئے بغیر وہاں سے بھاگ نکلا...... میرا خیال ہے

میں بہت زیادہ باتیں کر رہا ہوں۔" وہ ایک دم شرمندہ ہو گیا۔ "آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟"

میں نے اپنے بارے میں اُسے بتایا۔ "میرا چھوٹا سا کاروبار ہے۔ صبح دکان، شام ٹیلیویژن اور اتوار کو چڑیا گھر......"

"چڑیا گھر!" رینے کلاڈ نے کانٹا میز پر رکھ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ "بہت خوب چڑیا گھر بھی دلچسپ جگہ ہے...... مجھے یاد ہے کہ ایتھنز کے چڑیا گھر......"

"آپ کو سیاحت پر نکلے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا۔

"دو سال...... ایک ماہ اور آج کیا تاریخ ہے...... گیارہ! بس بائیس دن" اس نے فوراً جواب دیا۔

"ان دو سالوں میں آپ صرف پیرس سے لاہور تک ہی پہنچے ہیں؟"

"میرے منصوبے کے تحت مجھے اس وقت ہرات میں ہونا چاہیے تھا مگر افغانستان میں آج کل سیلاب آئے ہوئے ہیں اس لیے میں دو ماہ پیشتر ہی لاہور پہنچ گیا۔"

"آپ پیدل سفر کرتے ہیں کیا؟" میں نے اُکتا کر پوچھا۔ دراصل وہ سامنے والے کونے میں بیٹھا ہوا جوڑا اب کافی بار سے باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں" اُس نے خوش دلی سے کہا۔ "میں بس یا ریل گاڑی کے ذریعے سفر کرتا ہوں۔ ایران کے البرز سلسلۂ کوہ میں مَیں نے خچروں پر بھی سفر کیا۔ میرے سامان میں سات سوٹ کیس ہیں۔ بھلا میں پیدل کیسے سفر کر سکتا ہوں!"

"تو پھر دو سال میں پیرس سے لاہور؟"

"دراصل مجھے اگر کوئی شہر یا قصبہ پسند آ جائے تو میں وہاں دو چار روز کی بجائے دو چار ماہ تک پڑا رہتا ہوں...... پیرس والا فلیٹ بھی تو خاصے مہنگے داموں فروخت ہوا تھا...... اور پھر میں خود نہیں چاہتا کہ میرا سفر مکمل ہو جائے۔ میں پوری دنیا دیکھ لوں اور پھر بھی زندہ رہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں مروں تو میری آنکھیں کسی اجنبی سرزمین کے لہلہاتے

ہوئے سبز کھیتوں پر لگی ہوں...... میری آخری سانسوں میں انجانی فضاؤں کی مہک رچی ہو...... بجائے اس کے کہ میں اپنا سفر مکمل کر کے ایک مرتبہ پھر اُس تابوت...... اُس اولڈ پیپل ہوم میں واپس چلا جاؤں جہاں مرتے وقت تمام بوڑھوں کی آنکھیں آتشدان میں سُلگتی آگ پر ٹھہراتی ہیں اور جن کی آخری سانسوں کو سنٹرل ہیٹنگ کی گھٹن نچوڑ دیتی ہے...... میں واقعی زیادہ باتیں کر رہا ہوں...... مگر میرے پاس وقت بھی تو کم ہے......"

کھانے کا بل آیا تو میں نے زبردستی ادا کر دیا۔

"نہیں نہیں میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا" رینے کلاڈ نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

"آپ کے دوست کا بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے میں آپ کا بزرگ ٹھہرتا ہوں" میں نے ہنس کر کہا۔ "بل کی ادائیگی میرا اخلاقی فرض تھا"

"مجھے مشرق کی انہی روایات سے پیار ہے۔" اس نے صوفے پر رکھی چھڑی اُٹھائی نقشہ سمیٹ کر کیمروں والے تھیلے میں ڈالا اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے اب عجائب گھر دیکھا جائے۔" وہ قدرے لنگڑا کر چلتا تھا۔ ہم "کافی بار" کے پُرسکون ماحول سے باہر آئے تو لاہور کی مال پر کاریں، رکشا، ٹیکسیاں مست ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑتے چلے جا رہے تھے۔ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے ٹکٹ خریدے اور ہم عجائب گھر کے اندر چلے گئے۔

"ہا" اُس نے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر رکھے منقش دروازے کی جانب چھڑی سے اشارہ کیا۔ "پرسوں میں نے اسی قسم کے سینکڑوں دروازے شہر میں دیکھے۔ تمھیں اپنے پورے قدیم شہر کو عجائب گھر قرار دے دینا چاہیے۔"

وہ ہر مجسمے کے سامنے کھڑا ہو کر یوں ساکت ہو جاتا جیسے پتھر کا ہو۔ صرف اُس کے لب ہلتے رہتے۔ "خوبصورت...... پُرسکون...... حیرت انگیز...... وہ بڑبڑاتا اگرچہ میں بھی آج پہلی مرتبہ عجائب گھر دیکھنے آیا تھا مگر مجھے پتھر کے ان تودوں اور ٹوٹے پھوٹے دروازوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عجائب گھر میں بے شمار لڑکیاں بھی تو تھیں۔

پچھلے پہر جب ہم دونوں عجائب گھر سے باہر نکلے تو لاہور کی تپتی دوپہر ابھی تک پورے جوبن پر تھی۔ ہم باغیچے کے قریب سے گزرے تو رینے کلاڈ ایک پھولدار بیل کے

پاس کھڑا ہو گیا۔ "میں نے یہ سُرخ پھول مراکو میں بھی دیکھے تھے ..... انہیں پاکستان میں کیا کہتے ہیں؟"

"پتہ نہیں" میں شرمندہ سا ہو گیا۔ حالانکہ میں خود پھولوں کے بیجوں کا کاروبار کرتا تھا۔ صرف کاروبار۔

وہ کم از کم دس منٹ اُس پھولدار بیل کے پاس کھڑا بڑبڑاتا رہا۔ اگرچہ وہاں کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی۔

"اس خبطی بوڑھے کو ضرور سن سٹروک ہو جائے گا" میں نے سوچا۔

عجائب گھر کے کمپاؤنڈ سے باہر آکر میں نے اُس سے اجازت چاہی "مجھے واپس دکان پر جانا ہے ..... کاروبار! مجھے بیحد افسوس ہے۔"

"مجھے بیحد خوشی ہوئی ..... مہربانی بہت مہربانی ..... میں بھی اب واپس ہوٹل جا کر موسیقی سنوں گا ..... پاکستانی موسیقی" اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ آگے کر دیا۔

میں ہاتھ ملا کر جانے کو تھا کہ اُس نے مجھے روک لیا۔ "ایک منٹ" اس نے تھیلے میں سے کیمرہ نکالا اور آنکھ سے لگا کر بٹن دبا دیا۔ "شکریہ! آپ کی تصویر ..... بطور یادگار"

"میں آپ کے لیے کوئی ٹیکسی روکے دیتا ہوں" مجھے اُس کے بڑھاپے اور ہوٹل تک کے فاصلے کا خیال آ گیا۔

"نہیں نہیں" اُس کا متحرک سر زور سے ہلا "میں بس میں سفر کرنا پسند کرتا ہوں اس طرح مجھے لوگ ملتے ہیں۔ مہربان اور خوشگوار قسم کے لوگ"

ڈولنٹن مارکٹ کے قریب مجھے ایک ٹیکسی مل گئی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ "چوک گرالمنڈی"

ڈرائیور نے منہ بنایا مگر وہ اس سے پیشتر میٹر چلا چکا تھا۔ ٹیکسی سٹارٹ ہوئی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رینے کلاڈ چلچلاتی دھوپ میں یونیورسٹی کے بس سٹاپ پر کھڑا ایک خوانچے والے سے گنڈیریاں خرید رہا تھا۔ گنڈیریاں لیتے وقت اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بڈھا قسم کی شے۔

اور آج ٹھیک چار ماہ بعد اتوار کی صبح سنڈے ایڈیشن میں اسپیشن پلّون، بانگو ڈرمز اور

جدید بنگوں کے درمیان نیپال میں اس کی موت کی خبر چھپی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مرتے وقت اس کی آنکھیں اُس اجنبی سرزمین کے لہلہاتے ہوئے سبز کھیتوں پر لگی ہوں گی۔ اُس کی آخری سانسوں میں انجانی فضاؤں کی مہک رچ گئی ہو گی ..... اُس اولڈ پیپل ہوم سے ہزاروں میل دور جہاں اُس وقت اس کے ہم عمر بوڑھے آتشدان کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے ہوں گے۔ موت کے انتظار میں اولڈ پیپل ہوم، جہاں سے وہ ایک شرارتی بچے کی مانند بھاگ نکلا تھا۔ وہ اپنی موت کا انتظار کرنے کی بجائے اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ اُس کی وصیت کے مطابق اُسے نیپال کی کسی وادی میں دفن کر دیا گیا تھا۔ حکومت نے اس کے سات سوٹ کیس ..... جن میں سے ایک میں کسی کونے کھدرے میں اس کے پاکستانی دوست کے بھائی کی تصویر پڑی ہو گی "شکریہ! آپ کی تصویر بطور یادگار" فرانسیسی سفارت خانے کے حوالے کر دیئے ہوں گے۔ اس کے یہ سوٹ کیس فرانس میں اس کی بیٹی کے حوالے کر دیئے جائیں گے جو انہیں ناکارہ جان کر پیرس کے لنڈے بازار فلی مارکٹ میں بیچ ڈالے گی۔ نیپال کی وادی میں اس کا جسم مٹی میں ..... ایک انجانے دیس [illegible] جذب ہوتا چلا جائے گا۔ پیرس کی فلی مارکٹ میں اُس کے سامان میں شامل اشیاء آہستہ آہستہ بکتی جائیں گی اور یوں رینے کلاڈ ریزہ ریزہ ہو کر اپنا وجود اس دھرتی میں کھو دے گا۔ رینے کلاڈ جونارویے کے آدھی رات کے سورج کے مانند تھا۔ ایک ایسا دھندلا سورج جس میں حدت تو برائے نام تھی مگر جو اپنی زندگی میں روشن تر کرنے کی کوشش میں افق کے ساتھ ساتھ چلتا گیا یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے ایک اجنبی دیس کی مٹی میں اُتر گیا۔

"میں نے کہا آج ننھے کو چڑیا گھر نہیں لے جانا کیا؟" بیگم نے لحاف میں سے سر نکال کر کہا۔

"ہاں کیوں نہیں" میں نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔

رینے کلاڈ خوش قسمت تھا جو ایک مشترکہ تابوت میں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں خود بھی تو ایک عظیم تابوت میں دفن ہوں۔ مجھے بھی اولڈ پیپل ہوم کی طرح زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ بجلی کے ہیٹر، ٹیلیویژن، نرم بستر، نفیس کپڑے لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہم یہاں صرف مرنے کے لیے آتے ہیں۔ موت کے انتظار میں۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں بھی بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی موت ۔ اپنے ذاتی تابوت کی تلاش میں جانا ہے۔ میرے اس عظیم تابوت میں بھی بزرگی کا معیار قیام کی طوالت پر منحصر ہے۔ میرا تعارف مستنصر حسین تارڑ ..... تینتیس سال ....

پر پہاڑ کا منہ کھل گیا تھا، زبان باہر لٹک گئی تھی سنگلاخ سینے میں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

مقدس پہاڑی کے دامن میں البیسین کا مُورِش محلہ دھوپ میں سفید ہو رہا تھا۔ قدموں میں دریائے حدرہ کے پانی تھے۔ سامنے جبلِ سبیقہ پر سُرخ پتھر کا معجزہ، قصرِ الحمرا گرمی میں پھنک رہا تھا...... مگر لارنزو ان سب سے لاتعلق مُردہ آنکھیں کھولے جھولتا رہا۔

لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدّس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

شارع چاپنیر کے پچھلے ہوئے کولتار پر ابھی تک شراب کے خالی ڈرم، ریت کی بوریاں اور گھریلو فرنیچر بکھرا پڑا تھا...... لیکن کہیں کہیں خون کے دھبّے تھے سوکھے ہوئے، جیسے کسی بڑھیا کے لپ سٹک زدہ ہونٹوں پر پیپڑیاں اُبھرتی ہیں۔ یہاں بیری کیڈ تھا۔ البیسین کے باسیوں نے کئی روز تک فرانکو کی قاہر افواج کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ پورے غرناطہ سے کٹ کر استقامت کا ایک جزیرہ بن گئے۔ فاشسٹوں نے دریائے حدرہ میں سے سانس لینے والے پانی کے پائپ کاٹ دیئے تھے اور جب متعدد بچّوں کے پیاس سے مرجانے کے باوجود انھوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو البیسین پر ہوائی جہازوں سے بم برسائے گئے۔ بیری کیڈ ٹوٹا تو اس کے ساتھ ہی گھروں کی سفیدی کی ہوئی چمکتی دیواروں پر مکینوں کے خون اور گوشت کے چھیچھڑے یوں برسے کہ ان کے گہرے، ہلکے اور شوخ رنگوں کی تصویریں اُبھر آئیں۔ جنھیں آنے والی نسلوں نے مٹانے کی کوشش کی...... اُن پر قلعی کے کئی پوچے پھیرے مگر اُن کے رنگ اور گہرے ۔ مزید شوخ ہوتے چلے گئے۔ الحمرا کے بُرجوں تلے غرناطہ کے میونسپل قبرستان میں روزانہ سینکڑوں افراد آزادی سے سانس لینے کی خواہش کی پاداش میں اپنے جسم میں داخل ہونے والے سیسے کے بوجھ سے سرنگوں ہوتے رہے۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر عرب عہد کے ایک پُر فضا تالاب کے کنارے بھی فاشسٹوں نے آزاد خون کو منجمد کیا اور پھر اُسے ایک اجتماعی قبر میں بلڈوزروں سے دھکیل دیا۔ ان کی سینکڑوں لاشوں میں گارسیا لورکا کا مُردہ جسم بھی تھا۔ بلڈوزر کے سرد بلیڈ لورکا کے سرد تر جسم میں کھبنے پر بھی نہ جان سکے کہ یہ ایک شاعر کا بدن ہے کہ اس کے مرنے پر سوگواروں نے کہا تھا "گارسیا لورکا مر گیا۔ اب غرناطہ بغیر دل کے ہے۔"

سیاہ آنکھ میں تصویر

لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدّس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

اُنھوں نے اُسے صلیب پر میخوں سے گاڑنے کی بجائے ایک رسہ لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ میخیں مہنگی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ گاڑ دی جائیں تو آسانی سے اُکھڑتی نہیں، ضائع ہو جاتی ہیں۔ رسہ سستا ہوتا ہے۔ پھانسی دینے کے لیے کوئی اور مجرم نہ ملے تو اس کے ساتھ ڈول باندھ کر کنوئیں سے پانی نکالا جا سکتا ہے۔

اُس کی مُردہ آنکھیں کھُلی تھیں۔

گردن ایک ایسے زاویے پر ڈھلکی ہوئی تھی کہ دُور سے لگتا تھا جیسے وہ ہنستے ہنستے ایک دم ترچھا ہو کر ساکت ہو گیا ہو...... جیسے کسی "درج ڈاکٹر" نے چیتھڑوں سے بنے ہوئے گڈے کو رسّے سے باندھ کر لٹکا دیا ہو...... اور وہ بے اختیار جھولتا رہے۔

اُس کی مُردہ آنکھیں کھُلی تھیں۔

خانہ بدوشوں کے غاروں کے دہانے ششدر، حیرت زدہ کھُلے تھے جیسے ہابیل کے قتل

لارنزو کی سیاہ و مرجھائی ہوئی سکڑتی آنکھوں کے سامنے اُس کا محلہ البیسن سناٹے کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ایک جزیرے کی مانند آہستہ آہستہ جھُول رہا تھا...... قدیم مُورش حویلیاں سنسان پڑی تھیں اور اُن کے خاموش فواروں کے سُوکھے ہوئے تالابوں میں بچّوں کی لاشیں مُنہ کھولے دھوپ میں اکڑ رہی تھیں۔ مکانوں کے دروازے کھُلے تھے اور مکینوں کے پھٹے ہوئے جسم چوکھٹوں پر اوندھے پڑے تھے۔ سوکھی ہوئی نالیوں کی پیاس کے لیے گاڑھا خون ناکافی تھا کہ مکانوں میں سے نکلتے ہی وہ سُرخ چھیچھڑوں میں بدل چکا تھا۔ ہر سو خاموشی تھی صرف مقدّس پہاڑی پر کلیسا کا گھڑیال فتح کی خوشی میں جھُول رہا تھا اور اُس کی گونج البیسن کی فضاؤں میں بھوکے گدھ کی طرح تیر رہی تھی۔

لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدّس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

لارنزو کو ہسپانوی خانہ جنگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُسے نہ تو ڈی...... سے کوئی خاص اُنس تھا اور نہ ہی وہ فرانکو کے بارے میں اچھے یا بُرے جذبات رکھتا تھا۔ اُسے تو نیشنلسٹ اور ری پبلیکن کے الفاظ ادا کرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی...... وہ سیدھا سادا خانہ بدوش تھا۔ موسمِ گرما میں ملک کے طول و عرض میں منعقد ہونے والی گھوڑوں کی منڈیوں میں جاکر دہقانوں کو عمدہ نسل کے گھوڑے خریدنے میں مدد دیتا۔ مشوروں کی فیس وصول کرتا اور فرصت کے لمحات میں انہی دہقانوں کی جیبیں کاٹتا۔ سردیوں میں وہ اپنے مختصر غار میں بیٹھ کر بے تحاشا وینو پیتا اور شام کو اپنی بیوی اور بیٹی کو عصمت فروشی کے لیے بھیج کر خود مزید وینو پیتا اور بالآخر مدہوش ہو کر سو رہتا۔ کہنے کو تو اُس کے ہاں دس بچّوں نے جنم لیا مگر وہ ہر بچّے کی پیدائش پر اس کا ناک نقشہ دیکھ کر پہلے اطمینان کر لیتا کہ نومولود اسی کا ہے۔ اگر خدوخال میں اُس کی سیاہ آنکھوں اور خنجر کی نوک ایسی ناک کا کوئی شائبہ نظر آتا تو وہ اُسے بلا تکلّف کسی خانہ بدوش کو تحفتاً دے دیتا...... لڑکے جیبیں کاٹنے کے لیے موزوں تھے اور لڑکیاں ظاہر ہے عصمت فروشی کے لیے...... یوں اس کے پاس اس چھان پھٹک کے بعد صرف دو بیٹے آرتورو اور آندریس اور ایک بیٹی آدے لا بچی تھی۔ خانہ بدوشوں میں اُس کی شرافت کا چرچا تھا کہ وہ بچّوں کو اغوا کرنے کا بے حد مخالف تھا اور جوانی کے

ابتدائی ایام کے سوا اس نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا...... زندگی بے حد پُرسکون اور خوشگوار تھی مگر ایک روز جب وہ اپنے غار میں وینو کے نشے میں دھت لیٹا گٹار پر فلیمنکو کی دھن بے حد اوٹ پٹانگ طریقے سے بجا رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس دھن کے پس منظر میں کوئی ہولے ہولے پٹاخے چھوڑ رہا ہے۔ پہلے تو وہ اُسے خمار آلود ذہن میں کلبلاتے خون کا کرشمہ سمجھا مگر جب آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں تو وہ گٹار کی ٹیک لگا کر اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر آ گیا۔ تیز دھوپ اس کی سُرخ آنکھوں میں باندریلو کی برچھیوں کی طرح کھُب گئی۔ البیسن کے چند مکانوں کی سفید دیواروں کو دھواں چاٹ رہا تھا۔ گولیوں کی آواز بھی اُدھر سے ہی تیرتی آ رہی تھی۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا غار میں واپس آ گیا اور کچے فرش پر اوندھا لیٹ کر خنکی سونگھتا ہوا اُونگھنے لگا۔ اُس کے دونوں بیٹے جو نزدیکی قصبے لوشہ میں ہونے والے ایک گھوڑوں کے میلے میں گئے ہوئے تھے۔ شام کو لوٹے تو اُن کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔

"پاپا غرناطہ میں فرانکو کے فوجی داخل ہو گئے ہیں۔ البیسن کے باسیوں نے شارع چاپینز پر بیری کیڈ کھڑا کر کے اُن کا مقابلہ شروع کر دیا ہے...... ہم بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

لارنزو نے سر میں پھٹتے درد کے گرم ریشوں کو ماتھے پر چپت لگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور بیزاری سے بولا۔ "یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق! جتنے زیادہ مریں اُتنا ہی بہتر ہے۔ لاشوں کی جیبیں کاٹنا نسبتاً آسان کام ہے۔"

تھوڑی دیر بعد آدے لا غار میں داخل ہوئی تو وہ بھی پھٹے ہوئے کپڑے کی طرح سفید اور سلوٹوں سے بھرپور تھی۔ "دیکھو پاپا انھوں نے میرے کپڑے بھی پھاڑ دیئے۔ حالانکہ اگر وہ شرافت سے پیش آتے تو دو چار فوجیوں کے ساتھ ہمبستری کرنے سے میری چھاتیاں کونسی چھوٹی ہو جاتی تھیں؟"

لارنزو کو رہ رہ کر البیسن کے باسیوں پر غصہ آ رہا تھا کہ یقینی شکست کا سامنا کرنے کے باوجود وہ اتنی ڈھٹائی سے بیری کیڈ کا دفاع کیوں کر رہے تھے اور یوں وہ سارا دن غار کی تنہائی میں شراب سے لُطف اندوز ہونے کی بجائے کے کڑوے سگریٹ پھونکتا رہتا کہ تمام اہلِ خانہ نے خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد غار سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز وہ تنگ آکر اپنے پر شور غار میں سے باہر نکلا اور البیسن کے گلی کوچوں میں بے مقصد گھومنے لگا۔ چند روز پیشتر کے چیختے چلّاتے، پُر ہجوم اور زندہ البیسن کی بجائے اس کے سامنے ایک مُردہ محلے کے سنّاٹے تھے۔ صرف کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی گھُٹی گھُٹی آواز آتی اور بند ہو جاتی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ کا پتھر رکھ دیا ہو۔ ویرانی کے علاوہ اُسے جس چیز نے حیرت زدہ کیا وہ سُوکھے ہوئے فوّارے اور خشک نالیاں تھیں جو عربوں کے زمانے سے آج تک کبھی خشک نہیں ہوئی تھیں۔

"پانی کیوں نہیں چل رہا؟" اُس نے سوچا اور کندھے اُچکا کر واپس غار کی جانب چل دیا۔

"پانی کیوں نہیں چل رہا؟" اُس نے بے دھیانی میں چھت کی طرف دیکھا جس کے ساتھ اُس کا شراب کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔

"اُنھوں نے بند کر دیا ہے۔" آرتورو نے آہستہ سے کہا۔

"تم لوگ کیا پیتے ہو؟" اُس نے مشکیزہ اُتار کر ایک طویل گھونٹ بھرا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اُن سب نے بے دلی سے جواب دیا۔

"پچھلے کئی روز سے پانی بند ہے۔ فوجیوں نے حدرہ سے پانی کھینچنے والے پائپ کاٹ دیئے ہیں۔" آندریس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ "البیسن کے رہنے والے پیاسے ہیں۔ وہ اپنے باغوں میں سے پودے اُکھاڑ کر اُن کی جڑیں چُوس رہے ہیں۔ بیری کیڈ پر لڑنے والے نیم بیہوشی کے عالم میں ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سُوکھ گئی ہیں۔ بچّوں کی زبانیں اُن کے منہ سے باہر لٹک رہی ہیں۔ مُردہ سانپوں کی طرح۔"

"بچّوں کی زبانیں؟" لارنزو لوکھلا گیا۔ "لیکن یہ تو ظلم ہے۔ اُن کو تو پانی دینا چاہیئے۔ بچّے نیشنلسٹ یا ریپبلکن نہیں ہوتے......... وہ تو صرف......"

"ہمارا دماغ کیوں چاٹتے ہو، فرانکو سے جا کر پوچھو۔" اُس کی بیوی چیخی "کم از کم جب تک تمھارے شراب کے درجن بھر مشکیزے خالی نہیں ہو جاتے تم پیاسے نہیں مرو گے۔"

"لیکن یہ تو ظلم ہے......" لارنزو الکحل سے پھولتی زبان بار بار لبوں پر پھیر کر بڑبڑاتا رہا۔

اس روز لارنزو نے دو خالی مشکیزے کاندھے پر رکھے اور مقدس پہاڑی پر اُگے ہوئے تھوہر اور ناگ پھنی کے پودوں تلے پوشیدہ اُس قدیم غار میں اُترا جس کا علم پورے غرناطہ میں صرف اُسے ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مُوروں کے زمانے میں متعدد زیرِ زمین راستے البیسن کو دریا کے پار الحمرا کے سُرخ ایوانوں سے ملاتے تھے۔ صدیوں کا بوجھ ان خفیہ راستوں پر بھی پڑا، اور آہستہ آہستہ ان کے خالی پیٹ مٹی سے بھر گئے۔ عالمِ نوخیزی میں جب لارنزو نے اپنے ایک رقیب کو جسم میں میخیں گاڑ کر اُسی کے دروازے پر مصلوب کیا تھا تو یہ محض اتفاق تھا کہ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ایک ایسے راستے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ زیرِ زمین راستہ اگرچہ بے حد مخدوش حالت میں تھا مگر لارنزو کا لچکیلا جسم اس میں سے ایک سیاہ ناگ کی طرح رینگتا بل کھاتا دریائے حدرہ تک پہنچ جاتا۔ وہ کئی ماہ تک اس سرنگ میں روپوش رہا۔ بعد میں یہ خفیہ پناہ گاہ اس کی محرم بن گئی۔ بیوی سے ڈانٹ پڑتی تو وہ چپ چاپ اُس میں اُتر کر پہروں کڑھتا رہتا۔ جسموں کے استعمال کے لیے اُس نے یہی جگہ مخصوص کر رکھی تھی کبھی کبھار وہ تنہائی کا خواہشمند ہوتا تو شراب کا مشکیزہ کندھے پر ڈال کر اُس میں غائب ہو جاتا۔ مگر اس شب اس کے کندھے پر صرف خالی مشکیزے تھے۔

رات گئے جب لارنزو اپنے غار میں واپس آیا تو اُس کا نم آلود جسم مٹی سے یوں لتھڑا ہوا تھا جیسے وہ قبر میں سے نکل کر آیا ہو۔ اُس نے مشکیزوں کو کاندھے سے اُتارا اور زمین پر لیٹ گیا۔ "آرتورو!...... تم سب لوگ ایک ایک گھونٹ بھر لو...... ہم خانہ بدوش ہسپانویوں کی نسبت زیادہ سخت جان واقع ہوئے ہیں...... باقی پانی البیسن میں لے جاؤ اور پیاسے بچّوں کے حلق تر کر دو کہ بچّے نیشنلسٹ یا ری پبلکن نہیں ہوتے۔"

اگلے کئی روز تک لارنزو کا یہی معمول رہا...... اور بالآخر فضائی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بیری کیڈ ٹوٹ گیا۔ فرانکو کے فوجی البیسن میں داخل ہو گئے۔

غار سے نکلنے سے پیشتر اُس کے تینوں بچّوں نے ایک مرتبہ پھر اس کی منّت کی......

"پاپا وہ سب قتل کر رہے ہیں...... ہم سیرا نوادا کی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے لیے

جارہے ہیں تم بھی ساتھ چلو...... پاپا"

لارنزد کی الکحل سے پھولی ہوئی زبان بمشکل حرکت میں آئی "تم بزدل ہو...... وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے...... یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق!"

لارنزد کو ملٹری ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا۔

"یہ شخص بیری کیڈ پر لڑنے والے کیمونسٹوں کو پانی سپلائی کرتا رہا ہے۔"

لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

سیرا نوادا پہاڑیوں کی پتھریلی عافیت میں اُتر کر اُن تینوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مقدس پہاڑی کے سفید جسم پر گڑی صلیب سے لٹکتا ہیولیٰ ایک پُتلے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔ صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔ اُن تینوں نے اِن تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی روز تک روپوشی کا سفر کیا۔

ایک تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دوپہر نے انھیں دریائے حدرہ کے کنارے آباد قدیم قصبے تُوریا میں دیکھا۔ دریا کا خنک پانی ان کے جھلسے ہوئے نیم سیاہ بدنوں میں جذب ہُوا تو اُنھوں نے اپنے گرد نگاہ ڈالی...... پسینے سے نچڑتا ایک خاموش ہجوم مقامی بُل رِنگ کی جانب قدم گھسیٹ رہا تھا۔ وہ تینوں ان گرم جسموں کے الاؤ میں گم ہو گئے۔

کھنڈر نما بُل رِنگ کا نصف حصّہ سائے میں سستا رہا تھا اور بقیہ نصف حصّے کو دھوپ کے جلتے لب چوس رہے تھے۔ اکھاڑے کے درمیان میں ایک سیاہ بُل کا بھاری بھرکم دھبہ لرز رہا تھا...... اور اس کا کمر خمیدہ مالک فضا میں جھوٹے شور مچا رہا تھا "آئیے اور اس برادیتو بُل کے ساتھ دو دو ہاتھ کیجیے۔ پانچ منٹ کے کھیل کے لیے صرف دس پسینے۔"

دیہاتی نوجوان بوسیدہ پتلونیں اُڑستے، غرور سے اپنے جنگلی گھاس بالوں پر ہاتھ پھیرتے اکھاڑے میں داخل ہوتے اور دس پسینے مالک کی رالیں ٹپکاتی ہتھیلی پر رکھ کر پانچ منٹ کے لیے بُل کے آگے پیچھے ہو ہو کر کے دوڑتے، اپنی بہادری جتا کر ہانپتے ہوئے واپس اپنی نشستوں پر آ بیٹھتے۔ بڑے لڑکے آرتورو نے سیاہ آنکھیں میچ کر بُل کو غور سے دیکھا۔ "آندریس!"

اس نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ کا گدھ بٹھاتے ہوئے کہا "فرانکو کیسا ہے؟"

آندریس کی آنکھوں سے سیاہ حیرت پھوٹی اور رُبہ نکلی "تجھے کیا معلوم آرتورو، میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے دیکھا تو نہیں لیکن جانتی ہوں۔" آدرے لا نے گلے میں ہاتھ کی کُپّی اتاری اور پسینے سے شرابور چھاتیوں کو پونچھا۔ "وہ اُس موت کی طرح سیاہ ہے جس میں اُس نے ہمارے پاپا کے جسم کو ڈبویا ہے۔"

آرتورو کی نشست پر اس کا بوجھ ختم ہو گیا، وُہ اُٹھا، پہچان کا لمحہ آن پہنچا تھا "ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لیے دشمن نہ مل سکے تو اُس کی خصلت کے کسی اور شخص کو موت کے گھاٹ اُتار دو۔" اسی لمحے اس کے شانوں کے ساتھ دو سر نمودار ہوئے جو آندریس اور آدرے لا کے تھے...... "آرتورو تم نہیں جا سکتے...... سیاہ بُل بے حد طاقت ور ہے۔" لیکن تین سروں کی اُس قطار میں سے ایک سر نے حرکت کی اور بُل رِنگ کے درمیان جا کھڑا ہُوا۔

آرتورو نے دس پسینے ہتھیلی کی رال پر چپکائے اور سیاہ بُل کے سامنے گردن ٹیڑھی کر کے کھڑا ہو گیا...... بُل کی چمکتی آنکھوں میں ایک پُتلا جھول رہا تھا...... لارنزد کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

"یہ ہے تورو" آرتورو نے ریت پر تھوکا اور نفرت کا لعاب منہ سے پونچھ کر بُل کو شُشکارا۔ بُل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پُتلا جھول رہا تھا۔ "میں نے بستیوں کو ویران کیا ہے۔ بچوں کو پیاسا مارا ہے۔ نصف ہسپانیہ کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ یہ خانہ بدوش گِرہ کٹ کا بچہ میرے مقابلے پر...... ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لیے دشمن......۔"

آرتورو تپتی ریت پر پھیلا اپنے جسم میں اُترے ہوئے دو سینگوں کو تھامے بُل کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا...... اُس کی مردہ آنکھیں کُھلی تھیں اور...... بُل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پُتلا جھول رہا تھا۔

اُس شب آندریس اور آدرے لا نے دریائے حدرہ کی ریت میں اپنے بھائی کا مرد جسم

دفن کیا۔" ہمیں قسم ہے خانہ بدوشوں کے تمام دیوی دیوتاؤں کی...... ہم جب تک سیاہ بُل کو ہلاک نہ کر دیں گے ایک دوسرے کو ناموں کی بجائے حرامی سؤر کہہ کر پکاریں گے۔"

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔ صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔ اُن دونوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی برس تک سفر کیا۔ اس سفر کی سمت کا تعین سیاہ بُل کے سموں کے نشان تھے۔ بُل کے مالک کا بوڑھا ذہن جانتا تھا کہ دو نیم سیاہ جسم بدلتی رُتوں میں ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ گرم، سرد، نم آلود موسموں میں وہ اپنی روزی کے واحد وسیلے کی حفاظت کرتا، ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوتا......

آندریس اور رآدے لا کے لباسوں میں اُڑسے ہوئے خنجر کئی بار زنگ آلود ہوئے مگر انھیں ہسپانیہ کی دھرتی سے رگڑ کر پھر سے تیز کر لیا جاتا...... کون جانے کب؟......

قشتالیہ کے وسیع ریگزاروں میں پہاڑی عقابوں نے نیچے دیکھا...... کانٹے دار جھاڑیوں اور رگزاروں کے درمیان ایک بوڑھا ایک سیاہ دھبّے پر ہاتھ رکھے یوں چل رہا ہے جیسے وہ کسی بُل کا بھاری اور کھردرا جُثّہ نہ ہو بلکہ صابن کی ایک گیلی ٹکیہ ہو جو ذرا سی غفلت سے اُس کے ہاتھوں سے پھسل جائے گی اور کچھ فاصلے پر دو جسم جن کی چار سیاہ آنکھیں صرف ایک کالے دھبّے پر جمی رہنے کے لیے کھُلی تھیں۔

مُوروں کے ایک پہاڑی حصار کے کھنڈروں میں رہنے والے ایک اُلّو نے آنکھیں گھمائیں اور ٹوٹے ہوئے جھروکے میں سے اُس سڑک کو دیکھا جس پر زیتون کے باغ اُلٹے چلے آ رہے تھے...... اور سڑک پر...... ایک بوڑھا مگر اب بہت بوڑھا...... ایک سیاہ بُل مگر اب چمکیلے جسم کی بجائے ماند پڑتی ہوئی کھال اور کچھ فاصلے پر...... چار آنکھیں...... منتظر!

وُہ اپنے سفر کے دوران وادیٔ غرناطہ میں سے بھی ایک مرتبہ گزرے۔ مقدّس پہاڑی پر گڑی صلیب برسات کی بوچھاڑوں اور رگرما کی حدتوں سے شکستہ ہو کر گرنے کو تھی...... جھولنے والا نیلا اب غائب تھا مگر...... آندریس اور رآدے لا کے لیے نہیں کہ وُہ اسے بُل کی آنکھوں میں جھولتا ہُوا دیکھ رہے تھے۔

اُن دونوں نے اِن تینوں جغرافیائی حالتوں میں سات برس تک سفر کیا۔ ایک جانور، ایک انسان...... دو نیم سیاہ جسم۔

بالآخر بُل بوڑھا ہو گیا...... وُہ جو پہلے اُس کے ظلم سے خائف تھے، اب زیرلب احتجاج کرنے لگے۔ اُس کی دہشت اور طاقت کو دھرتی نے دھیرے دھیرے ختم کر دیا...... بُل بوڑھا ہوا تو ناکارہ ہو گیا کہ اب اس کے ساتھ کھیلنے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔ ایسے بیکار جسم کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اُسے کسی بوچڑخانے میں فروخت کر دیا جائے۔

کمر خمیدہ بوڑھا بوچڑخانے کے جس دروازے میں سے پیسیتو سے بھری جیبیں لے کر نکلا اُسی دروازے میں کچھ دیر بعد آندریس اور رآدے لا کے جسم داخل ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے خنجر آج صبح ہی تیز کیے تھے۔

بُل کو اُس کے بڑھاپے نے بوچڑخانے کے کچّے فرش پر بے سدھ لٹا رکھا تھا۔ اُن دونوں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا...... اُن میں ظلم کی تصویر ابھی تک واضح اور متحرک تھی کہ اس کے رنگ کبھی ماند نہیں پڑتے۔

بوچڑخانے کا مالک ان کے قریب آیا لیکن زیادہ قریب نہیں کہ خنجر آج ہی تیز کیے گئے تھے "تم کس نیّت سے یہاں آئے ہو؟"

"یہ سیاہ بُل ہمارے پاپا کا قاتل ہے...... اس کے سینگ ہمارے بھائی کے جسم میں لٹو کی طرح گھومے تھے...... ہم صرف اِسے اپنے ہاتھوں سے مارنے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

بوچڑخانے کے مالک کو اُسی شام یہی کام خاصی تگ و دو کے بعد خود سرانجام دینا تھا۔ بھلا اُسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

"تمھیں اجازت ہے۔" اُس نے کہا اور چلا گیا۔

رآدے لا گھٹنوں کے بل یوں بیٹھ گئی جیسے وہ کلیسا میں عبادت کرنے والی ہو...... اُس نے اپنا خنجر سیاہ بُل کی پھُولی ہوئی شہ رگ پر رکھا اور اُس کی آنکھوں میں اپنے پاپا کی تصویر دیکھی......

شہ رگ میں سے بوڑھا بدبودار خون ایک آبشار بن کر اُبلا...... اور آدمے لا کے سینے پر پھیل گیا۔ آدمے لا نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اپنا لباس چاک کر ڈالا...... اُس کی چھاتیوں نے آگے بڑھ کر اپنے مسام کھولے اور اُبلتے خون کو چُوسا، پیاس بجھائی...... پھر آندریس اُسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس نے مُبل کی ڈھلکی ہوئی گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مُبل کی مُردہ آنکھوں میں اب بھی ایک پتلا دکھائی دے رہا تھا، لیکن ساکت اور معدوم ہوتا ہُوا...... خنجر کی نوک نے سیاہ آنکھ میں کھُب کر اُسے اپنے مسکن سے یوں ادھیڑا جیسے انار کے دانے کو ناخن سے اڑس کر نکالا جاتا ہے......

سات برسوں سے زندہ جھولتے ہوئے پتلے کی شبیہہ اوجھل ہو گئی۔ دوسری آنکھ کو بھی خنجر نے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا...... پھر اُن دونوں نے آنکھوں کے خالی گڑھوں میں گزرے وقت کی، بیتے سفر کی تمام نفرت سمیٹ کر تھوکا...... آخری وار مُبل کے پیٹ پر ہُوا۔ اُن دونوں نے جب اُس کا نیم سیاہ کلیجہ ہاتھوں میں لیا تو وہ ابھی تک تھرتھرا رہا تھا...

وہ بوچڑ خانے سے باہر آ گئے...... ویران گرد آلود گلی کے درمیان میں اُنھوں نے ایک الاؤ روشن کیا، اس پر مُبل کا سیاہ پڑتا ہُوا کلیجہ بھونا اور پھر اُسے حلق سے اُتار کر اپنے وطن کی طرف، ایک روشن دوپہر کی جانب لوٹ گئے۔

پریم

اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانا کیسا ہوتا ہے؟ انسان دوسروں کو تو نہیں چھوڑتا کہ وُہ موجود رہتے ہیں، بیدار رہتے ہیں، سوتے ہیں، کھاتے پیتے اور ہنستے بھی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو، اپنی آنکھوں کو، پیاس اور بھوک کو، جاگنے اور مسکرانے کو بھی، جس لمحے وہ اپنے آپ کو چھوڑ کر جاتا ہے، اُس کے بعد آسمان پر ایک پرندہ تیرتا ہے مگر اُس کے آس پاس آنکھیں نہیں ہوتیں اُسے دیکھنے کے لیے۔ اُسی لمحے ایک کھڑکی کھُلتی ہے اور ایک آواز آتی ہے مگر اُس کے پاس کان نہیں ہوتے کہ وہ سُنے۔ درخت، راستے، موسم، زبانوں کے ذائقے اُسے اپنے آپ سے نوچ کر بہت پرے پھینک دیتے ہیں۔ اپنے آپ سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انسان دوسروں کو تو نہیں چھوڑتا۔ یہ تمام چیزیں اُسے چھوڑ دیتی ہیں اور یُوں وہ اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے لیکن اِس عبارت کا پریم سے کیا تعلق؟ پریم کہانی سے کیا رشتہ؟ بلکہ پریم کہانی سے شاید کچھ بھی نہیں، شاید میں نے یہ عبارت اس لیے لکھ دی ہے کہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ

رہا کہ میں پریم کی کہانی کا آغاز کس طرح کروں اور میں نے ایک تماشہ دکھانے والے کی طرح لفظوں کی پُر پیچ ڈگڈگی بجا کر آپ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ مگر میرے تھیلے میں کوئی ایسی حیرت انگیز چیز نہیں جو آپ لوگوں کی دلچسپی کا سامان بن سکے۔ پھر میں نے خواہ مخواہ ڈگڈگی کیوں بجائی؟ اس لیے کہ یہ میرا پیشہ ہے، لوگوں کو چونکانا انھیں اپنے گرد جمع کر کے یہ باور کرانا کہ میں ایک بہت ہی عظیم ادیب ہوں۔ حالانکہ میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں۔

لیکن پلیز ٹھہریے، میرا تھیلا اتنا خالی بھی نہیں، اس میں چند خطوط ہیں۔

اور ہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میری تحریروں پر ہمیشہ موت کا زرد سایہ رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟ شاید اس لیے کہ میں موت سے خوف زدہ تو ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ مجھے مسحور بھی کرتی ہے۔ اس زرد بدن محبوبہ سے ہم آغوشی کی تمنا چاہت میرے جسم کو بغاوت کا پیغام بھی دیتی ہے۔ زندگی کے بیشتر تجربوں میں سے گزرتے، انھیں بیان کرنے کے بعد ایک تشنگی سی رہتی ہے کہ ایک تجربہ ایسا ہے جس میں سے میں نہیں گزرا، حالانکہ اس میں سے گزر کر تو انسان بس گزر جاتا ہے، اُسے مقید تو نہیں کر سکتا مگر پھر بھی...... یہ فنا کا خوف ہی تو ہے جو انسان کو تخلیق پر اُبھارتا ہے، وہ چیزوں کو اُن کی موت سے قبل لفظوں میں ڈھال کر دوام دینا چاہتا ہے...... بہرحال پریم کہانی کا تعلق شاید موت سے بھی نہیں...... یہ ایک اور ڈگڈگی تھی جو میں نے بجائی تاکہ آپ میری بات سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے مداری کے تھیلے میں چند خطوط ہیں، سینکڑوں میں سے صرف چند جو اِدھر اُدھر اوجھل ہو کر پڑے رہے ورنہ میں انھیں بھی اپنے بیشتر خطوں کی مانند پرزہ پرزہ کر چکا ہوتا۔ میرے سفرناموں کی طرح ان خطوں کی سچائی کا ثبوت بھی میرے پاس موجود نہیں اور آپ بجا طور پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ یہ میرے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں اور بفرض محال اگر سچ مچ ایسے خطوط موجود ہیں تو وہ پریم کے نہیں کسی اور کے لکھے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر انھیں کسی ماہر تحریر کو دکھایا جائے تب

فیصلہ ہو سکتا ہے کہ پریم کی کہانی سچ ہے یا صرف ذہن کی پیداوار، مگر ماہر تحریر کو تو موازنے کے لیے پریم کی ایک آدھ اوریجنل تحریر حاصل کرنا ہو گی جو فی الحال تو قدرے ناممکن ہے کہ میں نے آج تک نہ تو پریم کو دیکھا ہے اور نہ اُس کی آواز سُنی ہے۔ البتہ میرے پاس اُس کی تصویریں ضرور موجود ہیں۔ مگر تصویر تو شاید لکھ نہیں سکتی۔

گرمیوں کی ایک گرم دوپہر کو (گرمیوں کی دوپہریں ہمیشہ گرم ہی ہوتی ہیں.... ہاہا) میں حسب معمول دکان پر براجمان تھا۔ ایک ایسے بیج کی طرح جو برفباری کے موسموں میں زمین میں دبا رہتا ہے خوابیدہ حالت میں۔ میں اسی قسم کی خوابیدہ حالت میں بیٹھا تھا کہ ایک "السلام علیکم" نے میری کھلی آنکھوں کو جو پہلے اپنے آگے حرکت کرنے والی اشیاء کو دیکھ تو رہی تھیں قبول نہیں کر رہی تھیں مزید کھول دیا اور میں نے ارشد کو دیکھا۔ وہ عجلت میں تھا۔

"یار میرا ایک کام کر دو۔" اُس نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میز پر رکھا اور اُسے تھپکنے لگا۔ "میری ایک قلمی دوست ہے ڈلہوزی میں، شیلا...... ہاں ہاں انڈیا میں...... اس کی ایک کلاس فیلو پاکستان میں کسی "مناسب شخص" کے ساتھ قلمی دوستی کرنا چاہتی ہے۔" "مناسب شخص" کی خصوصیات اُس تہہ شدہ کاغذ میں درج تھیں جسے ارشد بدستور تھپک رہا تھا۔

محترم ارشد صاحب!

میں آپ کی قلمی دوست شیلا کی کلاس فیلو ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان میں میرا کوئی ایسا قلمی دوست ہو جو سپورٹس کاروں میں دلچسپی رکھتا ہو (اگر کسی کار ریلی میں شامل ہو چکا ہو تو بہت بہتر ہے) موسیقی کی شُد بُد رکھتا ہو، رقص کر سکتا ہو، زندہ دل ہو اور لوگوں کو پسند کرتا ہو، انگریزی زبان پر عبور رکھتا ہو اور گڈ لُکنگ ہو۔

میں بے حد شکر گزار رہوں گی اگر آپ میرے خط کو اپنے کسی ایسے دوست کے حوالے کر دیں جو ان خصوصیات کے قریب تر ہو۔ شکریہ! پریم خانگراہ۔ سیکرڈ ہارٹ کالج۔ ڈلہوزی
ہماچل پردیش (انڈیا)

"......میں نے یہ ڈیمانڈ ڈرافٹ پڑھا اور شکریے کے ساتھ ارشد کے آگے رکھ دیا۔" اس خاتون کو سٹرلنگ موس، او[illegible] بلنٹ ہوپ، گریگوری پیک اور برٹرنڈ رسل کے آمیزے سے وجود میں آنے والا کوئی شخص درکار ہے...... سوری۔"

ارشد کے ہونٹ لرزنے اور چہرے پر وہ کیفیت نمودار ہوئی جسے منہ لبسورنا کہتے ہیں۔ اس حالت میں وہ بے حد مسکین اور معصوم نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے موقعوں پر میں لاشعوری طور پر ٹانی یا میٹھی سونف کے پیکٹ کے لیے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگتا ہوں۔

"اور پھر یار میں عمر کے اُس حصے کو پھلانگ چکا ہوں جب قلمی دوستی ایسے فضول مشاغل پر وقت ضائع کیا جاتا ہے۔" میں نے اپنے دفاع میں کہا۔

"پلیز میرے لیے...... یہ شیلا کی پہلی فرمائش ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔" ارشد بلبلیاں بناتے ہوئے پلکیں جھپک کر بولا "اور پھر اس لڑکی کا نام تو دیکھو کتنا خوبصورت ہے، پریم......"

"پریم؟" میں چونک گیا۔ خط پڑھنے کے باوجود میں نے نام پر غور نہیں کیا تھا۔

"ہاں۔ اِتنا خوبصورت نام اور اُوپر سے سکھنی بھی ہے۔"

"سِکھنی؟" میں نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بڑی ڈبل قسم کی۔" اُس نے سکوٹر کی چابی میز پر سے اُٹھائی اور دکان سے باہر چلا گیا۔

دوسرے روز میں نے اس خوبصورت نام والی اجنبی لڑکی اور سکھنی کو چند سطروں کا ایک خط لکھ دیا۔ غیر ارادی طور پر میری تحریر میں زہر آلودگی کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سپورٹس کاروں کا ذکر کیا تھا اور مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ سپورٹس سائیکل خرید سکتا۔ وہ مجھے اپنی ان ڈیمانڈز میں ایک بدبودار حد تک امیر اور نک چڑھی سی کڑاہی لگی! ایک ایسی ہی پاکستانی لڑکی کی طرح جو مجھے اچھی لگتی تھی مگر ایک روز جب اُس نے مجھے بتایا کہ وُہ روزانہ اپنے بالوں کو شیمپو کی بجائے درآمد شدہ بیئر کی دو بوتلوں سے دھوتی ہے تو میرا تمامتر ذاتی اعتماد بیئر کے جھاگ کی طرح ہی بیٹھ گیا اور میرا احساس کمتری جو میں خود فراموشی

شیلف پر رکھ کر بھول چکا تھا، دھڑام سے میرے سر پر آگرا۔ میں نے فی الفور اپنے آپ کو اس کے مداحوں کے گروہ سے علیحدہ کر لیا۔ بہرحال دوسرے روز میں نے اس خوبصورت نام والی اجنبی لڑکی اور سکھنی کو چند سطروں کا خط لکھ دیا۔

اگلے ہفتے پریم کا جواب آگیا۔ بائبل کے قدیم نسخوں جیسی انگریزی تحریر میں رقم کردہ ایک آزاد، بے فکر اور دوستانہ خط جس کے آخری فقرے نے میرے چوڑے ماتھے پر شکنوں کے دھاگے کاڑھ دیئے۔ لکھا تھا "اگرچہ تم میں وہ خصوصیات نہیں ہیں جو میرے نزدیک ایک آئیڈیل مرد میں ہونی چاہئیں مگر اس دنیا میں کون ہے جو پرفیکٹ ہے، گزارا کر لوں گی۔" میری اناکی کھلونا ریل گاڑی ایک دھچکے سے رُکی اور پٹڑی سے اُتر کر کچھوے کی مانند اوندھی ہو گئی۔ میں نے اُسے غصّے اور سکھوں کے احمقانہ لطیفوں کے لیور سے بمشکل سیدھا کر کے پٹڑی پر ڈالا مگر پھر وہ چلی نہیں، کھڑی رہی۔ میں نے پریم کو ایک اور زہر آلود خط لکھا جس میں میں نے اس کے آئیڈیل مرد کا دل کھول کر مذاق اُڑایا۔ خلافِ توقع پھر جواب آگیا۔

پریم کے خط آنے لگے۔ پہلے ہر پندرہ بیس روز کے بعد، پھر ہفتہ اور پھر شاید ہر روز ہی کاروباری خطوں کے پلندوں میں سے میری نظریں اُس کی آزاد اور مکمل دائروں والی تحریر کو تلاش کرنے لگیں۔ میرا زہر کم ہونے لگا۔

آج اس وقت میرے پاس اُس کے صرف چند خط ہیں۔ اُن سینکڑوں خطوں میں سے جو پریم نے مجھے ڈلہوزی اور دہلی سے لاہور اور بارسلونا لکھے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں دس برس بعد اُس کے بارے میں کہانی لکھوں گا تو میں یقیناً انہیں سنبھال کر رکھتا۔ مجھے معلوم نہ تھا، کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ میں نے پریم کو جتنے خط لکھے وہ تو ظاہر ہے کہ میں یہاں نقل نہیں کر سکتا کہ وہ تو پریم کے پاس ہوں گے۔ میں اب پریم کے بارے میں مزید باتیں نہیں کروں گا، وہ خود آپ سے باتیں کرے گی۔

سیکرڈ ہارٹ کالج۔ ڈلہوزی

یکم مئی ۶۸ء

پیارے مستنصر!

کتنی بے پناہ خوشی ہوئی مجھے تمھارا خط ملنے پر میں انتظار کر رہی تھی۔

اتنے عرصے کے بعد پڑھائی سے چھٹکارا پالینا کتنی خوبصورت بات ہے اور میں اسی فرصت کو بہانہ بنا کر تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ کل انگریزی کا پرچہ تھا اور آج صبح تاریخ کا۔ پرچے تو آسان تھے مگر میں کچھ نروس ہو گئی اور خوب الٹ پلٹ جواب لکھے میں نے نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ مجھے امتحانوں سے نفرت ہے۔ تمھیں نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے امتحان علم کی کسوٹی ہرگز نہیں ہوتے، بس رٹا لگایا اور امتحان کے فوراً بعد سب کچھ بھول بھال گیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمھیں بور کر رہی ہوں، سوری!

اچھا چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں مثلاً...... ٹھیک ہے میں تمھیں اپنے اور اپنے گھر کے بارے میں کچھ بتاتی ہوں۔ اگرچہ بتانے کے لیے میرے پاس زیادہ کچھ نہیں ہے میں اٹھارہ برس کی ہوں اور اگست میں انیس برس کی ہو جاؤں گی...... مگر میں انیس برس کی ہونا نہیں چاہتی، صرف اٹھارہ برس کا ہونا زیادہ اکسائٹنگ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ہمیشہ ایک ہی عمر کی رہوں۔

میں بہت لمبے قد کی ہوں اپنے خاندان کے دیگر افراد کی طرح۔ مجھے اتنی لمبی لڑکی ہونا بالکل پسند نہیں اور مجھے ہمیشہ خواب آتے ہیں میرا قد چھوٹا ہو گیا ہے اور میں اپنی سہیلیوں کے لیول پر آ گئی ہوں۔ ہاں کبھی کبھار مجھے اپنا قد اچھا بھی لگتا ہے۔ کیونکہ لمبی لڑکیوں پر لباس زیادہ سجتا ہے اور وہ ہجوم میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

میرے پاپا راجستھان کے رہنے والے ہیں اور میری ماں امرتسر کے قریب کسی علاقے ما جھے کی تھی۔ مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم دہلی میں رہ رہے ہیں۔ ہمارا گھر بہت پرانا ہے اور نئی دہلی کے مرکز میں واقع ہے۔ یہ کناٹ پلیس کے بہت قریب ہے، تمھیں پتہ ہے ناں کہ کناٹ پلیس سے بہت ساری سڑکیں نکلتی ہیں۔ کھمبا روڈ انہی میں سے ایک ہے۔

میرا کمرہ پہلی منزل پر ہے اور اس کی بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جو سڑک پر کھلتی ہیں۔

میں تمام دن ٹریفک کو دیکھتی ہوں میں ہمیشہ خواب دیکھتی رہتی ہوں اور باہر دیکھتی رہتی ہوں، نہ کتنے خوش قسمت ہو کہ تمھارے بہت سارے بہن بھائی ہیں۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں اور ان کی کمی محسوس کرتی ہوں۔ میرا صرف ایک بھائی ہے' اندرجیت۔ مگر جب بھی میں چھٹیوں میں گھر جاتی ہوں تو وہ تمام دن کالج میں گزارتا ہے اور باقی وقت دوستوں کے ساتھ اور یوں ہم مل نہیں سکتے۔ چنانچہ میں ہمیشہ اکیلی رہتی ہوں۔ اگرچہ مجھے لوگوں سے ملنا بہت پسند ہے۔ شاید اسی لیے میرے پاپا کو شکایت رہتی ہے کہ میرے کمرے میں دن رات میرے دوست اودھم مچاتے رہتے ہیں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ میرے پاس رہیں مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔

ہاں مجھے بھی تمھاری طرح ایک طے شدہ شادی قبول کرنا ہو گی۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ مثلاً میرا باپ بالکل اتفاق نہیں کرے گا کہ میں کسی جاٹ یا سکھ کے علاوہ کسی اور شخص سے شادی کرنے کا سوچوں بھی۔ میرا خاندان بے حد قدامت پرست ہے (اور میں گھر سے بھاگ تو نہیں سکتی، بھلا مجھے کون اغوا کرے گا؟ تم کرو گے؟) میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنا خاوند خود چنوں مگر مجھے اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ فی الحال میری منگنی نہیں ہوئی اور نہ مجھے خواہش ہے کہ ہو۔ میں کبھی بھی چھوٹے موٹے رومانس کو زیادہ آگے نہیں جانے دیتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ان کا اختتام شادی پر نہیں ہو سکے گا، پھر فائدہ؟ ویسے میں بہت سے لڑکوں کے ساتھ باہر جاتی ہوں، رقص کرتی ہوں۔ (میرا بھائی بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہے) لیکن صرف دوستی کی حد تک۔

میں چاہتی ہوں کہ پنجہ صاحب دیکھنے کے لیے پاکستان آؤں۔ مگر فی الحال یہ ناممکن ہے کیونکہ میرے پاپا کاروبار نہیں چھوڑ سکتے اور ان کے علاوہ اور کوئی نہیں جو میرے ساتھ جا سکے۔ میں کسی حد تک مذہبی تو ہوں مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مذہب کو مجھ پر ٹھونسے اور زبردستی اٹھا کر گوردوارے لے جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری دعائیں دل سے نکلیں۔ کیا تم مذہب پر یقین رکھتے ہو؟ اکثر لڑکے نہیں رکھتے۔

ان سردیوں میں میں نے بہت کچھ پڑھا۔ دیلی آف ڈولز، آر گڈون اور انجلیک وغیرہ۔

اور کیا میں نے تمھیں بتایا ہے کہ میری ایک دوست کے والد کے پاس اڈولف ہٹلر کی کار ہے۔ اس کا نام ہے۔ اتنی بڑی سے نال اور ظاہر ہے بیحد شاہانہ۔ ہٹلر نے یہ کار کسی ہندوستانی مہاراجے کے ہاتھ فروخت کی تھی اور اُس نے اُسے میری دوست کے والد کے ہاتھ بیچ دیا۔ اتنا مزا آتا ہے اُس میں بیٹھ کر کبھی کبھی یوں احساس ہوتا ہے جیسے ہٹلر بھی ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن جس شے پر میں باقاعدہ عاشق ہو چکی ہوں وہ ہے ۶۷ ماڈل کی جیگوئر۔ اتنی خوبصورت اور سمارٹ۔ میں نے جو دیکھی وہ سلور طوطی اور دہلی میں اُڑتی پھرتی تھی۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ وہ میری ہو اور اس کے علاوہ ایک سِلور رولز رائس ہو اور بہت ساری نیلی مرسڈیز کاریں...... مگر یہ سب خواب ہے۔ ایک اور کار فراری بھی بہت پاپولر ہے، طا قتور اور ایکسائٹنگ۔

اگلے خط میں میں تمھیں ڈل (ڈلہوزی) کے بارے میں لکھوں گی۔ اور پلیز جلدی لکھنا۔

پریم

کتنی احمقانہ خواہش کہ میں ہمیشہ ایک ہی عمر کی رہوں۔

میں نے ماجھے کی جٹّی کی اس کانونٹ میں پڑھنے والی بیٹی کو اس خط کے جواب میں بہی کچھ لکھا اور آخر میں یہ بھی کہ شادی کے لیے تمھارے والد کی عاید کردہ شرطوں میں سے ایک تو میں پوری کرتا ہوں کہ خالص جاٹ ہوں، البتہ فی الحال مکمل طور پر سکھ نہیں ہوں اور اس کے بارے میں تبھی سوچا جا سکتا ہے جب میرے پاس تمھاری کوئی فیصلہ کُن تصویر ہو۔

ڈلہوزی

۶۹ - ۸ - ۲۸

ڈیئر مستنصر!

تمھیں معلوم ہے تمھارے خط نے مجھے کتنی خوشی دی؟ تمھیں نہیں پتہ۔ مجھے فالتو وقت اتنا کم ملتا ہے اور اگر مل جائے تو کوئی پُرسکون جگہ نہیں ملتی۔ ہر کونے کھدرے میں لڑکیاں کیڑوں کی طرح رینگ رہی ہوتی ہیں۔ بہرحال اس وقت خوش قسمتی سے میں اکیلی ہوں اپنے خیالات کے ساتھ اور صرف تمھارا خط میرا رفیق ہے۔ اور یہ کتنا خوبصورت رفیق

ہے، تمھیں پتہ ہے؟ نہیں پتہ)

مستنصر! دراصل میں نے تمھیں اپنے خاندان کے بارے میں ہر چیز بالکل سچ نہیں بتائی۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے میں چھیڑنا نہیں چاہتی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم میرے دوست بنو اور میں صرف تم سے دل کا حال کہہ ڈالوں۔ میری ماں نہیں ہے۔ میں صرف نو سال کی تھی جب وہ مر گئی۔ چند برس بعد میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ (میں شاید اس وقت چودہ برس کی تھی) اور اب میری ایک چھوٹی سی نصف بہن ہے، وہ چار برس کی ہے اور بہت ہی پیاری۔ میں جب چھوٹی تھی تو اپنے باپ کی پرستش کیا کرتی تھی، ہاں واقعی میں تہ دل سے اُسے پوجتی تھی مگر دوسری شادی کے بعد ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے گئے۔ میری ماں ایک بے پناہ حسین عورت تھی (مجھے طویل قامتی ورثے میں ملی ہے اور چیزوں کے علاوہ) اور وہ مجھے بیحد یاد آتی ہے۔ ایک لڑکی کو اپنی ماں کی ضرورت ہوتی ہے خاص طور پر جب وہ جوان ہو رہی ہوتی ہے۔ میں دُنیا کی ہر شے تیاگ دوں اگر میری ماں مجھے واپس مل جائے۔ اُس کے بغیر میں بیحد اکیلی ہوں۔ ویسے میرا باپ مجھ سے بیحد لاڈ کرتا ہے۔ ہمارا ایک گھر ہے۔ خوبصورت ترین اور بہت بڑا (تمام پُرانے گھر ہوتے ہیں) میں اپنے گھر کی ایک تصویر بھیج رہی ہوں۔ میرا بیڈروم وہ بڑی کھڑکی والا ہے۔ دائیں ہاتھ پر جہاں بیٹھ کر میں باہر دیکھتی ہوں اور خواب دیکھتی ہوں۔ میں تمھیں اپنے تمام دوستوں کے بارے میں بھی بتانا چاہتی ہوں مگر مجھے معلوم نہیں کہ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوں گی۔ ان میں ایک نلنی ہے جس سے میں بیحد پیار کرتی ہوں۔ ہم سکول میں اکٹھی پڑھتی تھیں۔ اب وہ دہلی کے ایک کالج میں ہے۔ ماہیپ اور میں بھی بہت اچھی دوست ہیں۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے اور ہر لڑکے پر نظر رکھتی ہے، جسے چاہتی ہے فالو کر لیتی ہے۔ یہ خیال کیے بغیر کہ کسی دوسری لڑکی کے جذبات مجروح ہوں گے۔ اُس کی بہن پردیپ پستہ قد کی لڑکی ہے، جو ایک چشمے کی طرح پھوٹتی ہے۔ الاپے ہم سب میں سے سوبر ہے اور رامبر سب سے شوخ۔ اور جتنی لڑکوں کے ساتھ میں گھومتی ہوں مستنصر؟ وہ پورے دہلی میں سب سے زیادہ ہینڈسم اور

اور سب سے زیادہ نکمے ہیں۔ ایک ایسا وقت تھا جب آدھے ہندوستان میں اُن کی دھوم تھی۔ میں اِس گینگ میں اُن کی بہن امبر کے ذریعے داخل ہوئی اور رلوچی نے بھی میری مدد کی۔ میں ان لڑکوں کے بہت قریب تھی (اور ہوں) جیکو اور بادل جتنے ہینڈسم مرد میں نے آج تک نہیں دیکھے اور انھیں بھی اس بات کا علم ہے (یاد رہے میں نے تمھیں ابھی نہیں دیکھا) میں نے آج تک انھیں کسی لڑکی کے بارے میں سنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اُن کو صرف ایک رات کی تفریح کے طور پہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لڑکے صرف دوستوں کی حد تک تو ٹھیک ہیں۔ لیکن ان سے رابطہ بڑھانا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہے۔
ان کی چھوٹی بہن امبر بھی ایسی ہے کہ ہر لڑکے کی طرف اتنا ہی فاصلہ طے کرتی ہے جتنا وہ کرتا ہے اور مستنصر یہ فاصلہ میرے حساب سے تو کچھ زیادہ ہی ہے۔ مجھے بادل بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ ذہانت کے معاملے میں صفر ہے اور شراب کے معاملے میں سو فی صد اور اس کے علاوہ اس کا ذہن صرف ایک راستے پر چلتا ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ کونسا راستہ ہے اور میں بہر حال اس راستے پر کھڑے رہنے کا رِسک نہیں لے سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ جس طرح میں بتا رہی ہوں یہ لڑکے بہت خوفناک لگتے ہیں اور مجھے اُن سے نہیں ملنا چاہیے مگر دوستی کی حد تک تو حرج نہیں اور وُہ بہت اچھے دوست ہیں۔
او تُے بیہودہ لڑکے کیا مطلب ہے تمھارا کہ اگر میں گندی کتابیں پڑھنا چاہتی ہوں تو بیشک پڑھوں۔ میرا رنگ "گندی" کا لفظ پڑھ کر سُرخ ہو گیا (ہاں سچ مچ) مجھے بالکل شوق نہیں گندی کتابیں پڑھنے کا اور اگر "انجلیک" پڑھتے ہوئے ایک دو مقامات ایسے آ گئے تو اس میں میرا کیا قصور؟

اوہ میں اتنی خوش ہوئی یہ پڑھ کر کہ تمھیں بھی سٹائلش کپڑے پہننے کا شوق ہے۔ میں چونکہ لمبے قد کی ہوں اس لیے کپڑے مجھ پر بہت سجتے ہیں۔ مجھے بھڑکیلے شوخ رنگ پسند ہیں۔ مثلاً چبھتا ہوا پنک، اورنج، لائم گرین اور پرپل۔ مجھے ایسے رنگ اچھے نہیں لگتے جو پھیکے اور نامعلوم سے ہوں۔ اور ہاں میرا ایک گناہ پرفیوم ہیں۔ میرے پاس بہت ہیں اور میں مرتی ہوں اِن پر۔ اس مرتبہ جب میں دہلی جاؤں گی تو تمھیں وہاں سے کف لنکس بھیجوں گی۔ اچھا

تو مجھے لاہور آکر گرمی کا مزہ چکھنا چاہیئے۔ سچ بتاؤ مستنصر کیا میں واقعی اس گرمی میں روسٹ ہو جاؤں گی؟ ٹھیک ہے کبھی نہ کبھی میں یہ دعوت ضرور قبول کر لوں گی اور لاہور آؤں گی۔ کیا یہ دعوت ہمیشہ کے لیے برقرار رہے؟
ڈلہوزی آرامدہ حد تک خنک ہے۔ مان سون زوروں پر ہیں اور بے پناہ بارش ہو رہی ہے۔ مجھے یہ موسم اچھا نہیں لگتا۔ مجھے گرمی اور دھوپ پسند ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس خط میں ڈلہوزی کی سردی بند کر کے تمھیں بھیج دوں، بس تھوڑی سی کیا تمھیں یہ پہنچی؟ میں نے بھیج دی ہے۔
شام کو کانونٹ کی سب لڑکیاں ہوسٹل سے بھاگ کر فلم دیکھنے جا رہی ہیں۔
میں تمھیں چند فضول سی تصویریں بھیج رہی ہوں۔ یہ پہلی تصویر تب کی ہے جب ہم ایک پہاڑی پر چڑھنے والے تھے اور میں اپنی ساڑھی درست کر رہی تھی۔ لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں کیونکہ یوں لگتا ہے کہ میں ساڑھی اُتار رہی ہوں۔ تم نے میرے لمبے بالوں پر دھیان دیا؟ میرے بال لمبے اور گھنے ہیں۔ دوسری تصویر میں جو کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں ہے۔ میں ایک کڑکنے والی بجلی کا تاثر دیتی ہوں۔ مگر یہ غصہ تمھارے لیے نہیں ہے۔ بس سُورج میری آنکھوں کے سامنے تھا اور میں نے منہ بنا لیا۔ تیسری تصویر تمھیں شاک کرے گی۔ کیونکہ اس میں دُلہن بنی ہوئی ہوں۔ یہ ایک فینسی ڈریس کی ہے، اور دیکھو میں باقاعدہ شرما بھی رہی ہوں۔ میں اچھی لگتی ہوں ناں دُلہن کے سُرخ لباس میں؟ اور ہاں مجھے یاد آیا میری ان تصویروں کو دیکھ کر تم سِکھ ہونے پر آمادہ ہو؟ میرا خیال ہے تمھارا ذوق اتنا بُرا نہ ہو گا کہ مجھے پسند کرو۔ اب مجھے خط ختم کرنا ہو گا ورنہ لفافے میں نہیں آئے گا خوش رہنا مستنصر اور فوراً لکھنا مجھے۔

پریم

کتنا احمقانہ خوف کہ وُہ روسٹ ہو جائے گی، جل جائے گی۔
اور ہاں پریم نے جو تصویریں بھیجیں، وہ واقعی فیصلہ کُن تھیں۔ مجھے وُہ اچھّی لگی۔ جس تصویر میں وُہ اپنی ساڑھی درست کر رہی ہے اُس میں اس کی گندھی ہوئی دبیز چوٹی اس

طرح لٹک رہی ہے کہ اس کے بوجھ سے پریم کا گول اور بھرا بھرا چہرہ ایک جانب جُھک سا گیا ہے۔ دوسری تصویر میں اس کا لامبا قد جو اُسے ماجھے کی ایک جٹی سے ورثے میں ملا ہے یوں نکلتا دکھائی دے رہا ہے کہ اسے دیکھ کر "ماہی سرو دے بوٹیا" کے بول مجھے پہلی مرتبہ سچ لگے۔ مائیکل انجلو کے مجسمے "داؤد" کی طرح اُس کے بازو اتنے لمبے اور متناسب ہیں کہ جیسے وہ اسی طرح کھڑے کھڑے زمین کو چھُو لے گی۔ ان سب تصویروں میں سب کچھ ہے مگر خوشی نہیں ہے، جیسے راہ تک رہی ہو اور جو کچھ اُسے اُس راہ پر نظر آ رہا ہے وہ کچھ ایسا دل پسند نہیں..... یہ تصویریں یقیناً فیصلہ کُن تھیں مگر میں ڈھیٹ بن گیا۔ بھلا ایک ایسی لڑکی کے لیے جس کی آواز سُنی نہ ہو، چہرہ دیکھا نہ ہو اُس کے لیے سکھ ہو جانے کا خیال کیا ایک سکون ایسا خیال نہیں ہے؟

ڈلہوزی

۲۳ نومبر ۶۸ء

ہیلو اجنبی!

میں تم سے بیحد ناراض ہوں تم نے بھُلا دیا ہے اور لکھتے تک نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لوں اور کبھی نہ لکھوں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم اتنے ظالم ہو کہ جب میں نے تم سے درخواست بھی کی تھی کہ لکھتے رہنا تو کیوں نہیں لکھا مجھے؟ تمھارا خط آنے پر میں نرم پڑ گئی۔ اگرچہ یہ ایک طویل اور خوبصورت خط تھا مگر پھر بھی کسی طور تاخیر کا مداوا نہ تھا۔ چلو فوراً معافی مانگو مجھ سے کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گے۔

میرے امتحان ختم ہو گئے اور میں اب جتنا جی چاہے اُدھم مچا سکتی ہوں۔ آج نتیجے کا اعلان ہوا۔ اس امر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے پچھلا ایک ماہ دہلی میں خوب مزے کئے رزلٹ اتنا بُرا نہ تھا۔ البتہ انگریزی میں کچھ کمی رہ گئی ہے جس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔ پچھلے برس میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔

کچھ عرصے سے راہباؤں کے ساتھ میری بہت کھٹ پٹ رہتی ہے تمھیں راہباؤں اور ان کے عادات و اطوار کے بارے میں کچھ علم ہے؟ میرا خیال ہے کہ راہبائیں بہت

وحشتناک چیزیں ہوتی ہیں اور میرے ایسی چھوٹی اور بھولی لڑکیوں کو اُن کے حوالے نہیں کرنا چاہیئے۔ زندگی اور محبت کے بارے میں اُن کے نظریات بہت گمراہ کُن ہوتے ہیں۔ ادھر ذرا سی بات ہوئی اور اُدھر اُنھوں نے ایک گندی ناویل نکال لی۔ جی نہیں چاہتا یہاں رہنے کو مگر مجبوری ہے۔ پاپا مجھے دہلی میں داخلہ لے کر نہیں دیتے۔ خیر صرف ایک برس رہ گیا ہے اس ٹھنڈے جہنم میں اور پھر چھٹی ہمیشہ کے لیے۔ کیا تمھیں میری باتیں بچگانہ لگتی ہیں؟

سو میرے ہینڈسم دوست تم ابھی تک پُرانی محبتوں کو نہیں بھُولے؟ محبت کتنی خوفناک چیز ہوتی ہے۔ تم ایک اجنبی کو اپنا مالک بنا کر تمام تر طاقت اُس کے ہاتھ میں دے دیتے ہو۔ دُکھ دینے کی، خوشی دینے کی، اُداس کرنے کی طاقت۔ کسی کو بھی اتنا اختیار نہیں دینا چاہیئے اپنے اُوپر۔ میں تمھیں چیکو کے بارے میں بتاؤں؟ وہ امبر اور رباول کا بڑا بھائی ہے۔ میں پندرہ برس کی تھی جب اُسے ایک شادی پر پہلی مرتبہ ملی اور تب سے اُسے چاہتی ہُوں۔ وُہ بھی مجھے چاہتا ہے مگر ہمارا ذہنی رجحان ایسا ہے کہ ہم زیادہ دیر تک ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ بنیادی طور پر ایک لڑکی کے ساتھ گزارہ کرنے والا مرد نہیں ہے ہر لڑکی کے ساتھ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور میں ایک بیوی کی حیثیت سے یہ کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ بہرحال وُہ فی الحال مجھ سے شادی نہیں کر سکتا اور شادی کے بغیر میں اُسے اپنے قریب نہیں آنے دینا چاہتی "قریب" کا مطلب جانتے ہو نا چھوٹے بچے؟) اور یہی مسئلہ ہمارے درمیان رنجیدگی کا باعث بنتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہماری لڑائی ہو گئی اور میں جتنی دُکھی ہُوں وہ اُتنا ہی کم متاثر ہُوا ہے۔ وہ بہت ہینڈسم ہے۔ (کیا تم جل گئے ہو؟)

تصویروں کا شکریہ۔ تمھارے چہرے پر بہت بشاشت ہے تمھاری آنکھیں اتنی زندہ ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں ایک ساکن تصویر پر وُہ اتنی زندہ کیوں لگ رہی ہیں۔ تمھاری بہنیں بھی خوبصورت ہیں۔ اُن کے گالوں کی ہڈیاں بے پناہ متاثر کرتی ہیں اور جبڑوں کی لائن بہت پرفیکٹ ہے۔ مجھے تراشیدہ ساخت کے چہرے اچھے لگتے ہیں۔

کیا مطلب ہے تمھارا کہ میں صرف اس لیے شادی کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میں ان دنوں

گندی گندی کتابیں پڑھ رہی ہوں؟ احمق ہو تم مستنصر ڈیئر۔ جب میں یا میرا خیال ہے کوئی بھی لڑکی شادی کے بارے میں سوچتی ہے تو اس میں صرف محبت، استحکام اور اپنا گھر بنانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ تم لڑکے شادی کو صرف جنس کے ساتھ کیوں نتھی کر دیتے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک لڑکے کا دماغ کس طرح لڑکی کی نسبت مختلف سطح پر سوچتا ہے۔ واقعی میں نے کوئی جنسی بات نہیں سوچی تھی۔ ویسے مستنصر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی چھت کے نیچے میں ایک ایسے شخص کے ساتھ کس طرح زندگی گزار سکوں گی جس سے میں محبت نہیں کرتی کیونکہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میری شادی تو ماں باپ کی مرضی سے ہی ہو گی۔ تم کس طرح ایک اجنبی شخص کے ساتھ جسمانی ربط قائم کر سکتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو کہ میری سوچ احمقانہ ہے؟ شاید اِن سردیوں میں میری شادی ہو جائے۔ ہو سکتا ہے شاید۔ لیکن جب بھی میری شادی ہو گی میں تمھاری دوست رہنا چاہتی ہوں (وہ خط یقیناً مختصر ہوں گے یہ پہلے سے بتا دوں) اور اگر تمھاری شادی ہو جائے تو؟ کیا تم مجھے لکھتے رہو گے؟ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم لکھو گے۔

تم واقعی فنونِ لطیفہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ مجھے بھی دلچسپی تو ہے، مگر ماڈرن آرٹ میرے پلے نہیں پڑتا۔ ایک مرتبہ مجھے مونالیزا کے بارے میں ایک مضمون لکھنا پڑا تھا جس میں اُس کی مُسکراہٹ کے بارے میں تشبیہات کی ایک طویل فہرست تھی پیرس کی ایک لڑکی نے کہا تھا "یہ نسوانی منافقت سے بھرپور ایک مسکراہٹ ہے۔ میں اِسی طرح اپنے خاوند کے سامنے مُسکراتی ہوں" ویسے مجھے تو یہ مسکراہٹ لگتی ہی نہیں۔ ہونٹوں کا کَرو بہت چھوٹا ہے۔ کیا تم نے یہ تصویر دیکھی ہے؟

اُردو شاعری یقیناً خوبصورت ہو گی کیونکہ یہ زبان بھی تو خوبصورت ہے۔ شاعری پڑھنا میرے لیے سکون کا باعث بنتا ہے۔ مجھے ٹیگور، عمر خیام اور خلیل جبران پسند ہیں۔ ٹیگور ننھے منے پھولوں اور خدا کی عظمت پر نظمیں لکھتا ہے۔ میں نے خلیل جبران کی "سرکش روحیں" پچھلے دنوں پڑھی تھی۔ ہمارے کالج میں تین مسلمان لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے ایک ہما نجیب میری دوست ہے، اُس نے مجھے اُردو سکھانے کی کوشش کی تو میں نے تمھارا نام لکھنا چاہا۔ بہت مشکل تھا۔ وہ میرے ساتھ اُردو بولتی ہے یعنی صبح بخیر اور شام بخیر اُردو میں ہی کہتی ہے۔

اچھا تو تم اپنے گھر میں پنجابی بولتے ہو؟ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کیا تم اسے لکھ بھی لیتے ہو؟ دہلی میں ایک نئی ڈسکوتھیک کھلی ہے۔ سُنا ہے کہ وہ "سیلرز" سے بھی زیادہ پاگل اور پُرشور جگہ ہے۔ کمال ہے مجھے یقین تھا کہ "سیلرز" سے بڑھ کر کوئی اور جگہ ہو ہی نہیں سکتی کبھی نہ کبھی میں ضرور لاہور آؤں گی اور ہم دونوں وہاں کسی ڈسکوتھیک میں جائیں گے۔ ٹھیک ہے؟ تمھیں پتہ ہے راہباؤں کا خیال ہے کہ میں خوفناک حد تک بُری لڑکی ہوں کیونکہ لڑکے میرے دوست ہیں اور میں اُن کے ہمراہ پارٹیوں میں جاتی ہوں۔ بھلا جو کچھ میں دہلی میں کرتی ہوں اُس سے ان کا تعلق؟ تمھارا کیا خیال ہے؟

ڈَل اتنا خوبصورت ہے۔ ہندوستان کے خوبصورت ترین پہاڑی مقامات میں سے ایک۔ لیکن مجھے پسند نہیں۔ ڈل ہوزی بہت ہی ڈَل ہے۔ ڈَل۔ ڈَل۔

او ہو چودہ صفحے ہو گئے مستنصر! میں نے خط لکھنے کی بجائے ایک کتاب لکھ دی ہے۔ لفافہ بہت بھاری ہو جائے گا اور میں اتنی سردی میں مزید ٹکٹوں کے لیے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ پیار!

پریم

کتنی احمقانہ دھمکی کہ میرا جی چاہتا ہے میں تم سے ہمیشہ کے منہ موڑ لوں اور کبھی نہ لکھوں! محبت کتنی خوفناک ہوتی ہے۔ پریم کے ان الفاظ کی سچائی کا ثبوت مجھے بہت برس بعد ملا، لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ ایک اجنبی کو مالک بنا کر، تمام تر طاقت اس کے ہاتھ میں دے کر دُکھ دینے کی، خوش کرنے کی، اُداس کرنے کی طاقت۔ مجھے زندگی میں پہلی بار سکون ملا۔

سیکرڈ ہارٹ کالج

ڈلہوزی

۲۲ مارچ ۶۹ء

مستنصر!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں غصّے سے پھٹ پڑوں، تم سے رُوٹھ جاؤں یا یہ تم

تعلق ہمیشہ کے لیے توڑ دوں۔ میں نے تمھیں سردیوں میں اتنے خط لکھے، ایک پوسٹ کارڈ بھی، مگر تم بالکل خاموش رہے۔ پہلے مجھے شک ہوا کہ میرے خطوط ڈاک کی ہڑتال میں کھو گئے ہیں مگر جو خط میں نے دوسروں کو لکھے وہ توری ڈائرکٹ ہو کر مجھے واپس مل گئے، تمھارے نہیں ملے، اس کا مطلب ہے وہ تمھیں ملے ہیں تم پھر کیوں نہیں لکھتے مجھے۔

آج ہفتہ ہے میری چھٹی کا دن اور قدرتی طور پر موسم کو آج ہی بکواس ہو جانا تھا۔ جس روز میں کھڑکی سے باہر دیکھوں اور مجھے دھند اور بارش نظر آئے تو مجھے فوراً علم ہو جاتا ہے کہ یہ میری چھٹی کا دن ہی ہوگا۔ میں باہر نہیں جا سکتی اور ساری شام اکیلی بیٹھی رہتی ہوں۔ سکول کی بچی کی طرح، اکیلی اور اُداس۔

دہلی میں چھٹیاں بہت مزے سے گزریں۔ پچھلے ماہ وہاں ایک کار ریلی ہوئی۔ ہم سب ایک جیپ میں سوار ہو کر ساتھ گئے جسے بادل نے تیز ہوا کی طرح چلایا۔ وہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑا جا رہا تھا۔ اُس کے اتنے حادثے ہو چکے ہیں کہ اگر ایک اور ہو جاتا تو کسی کو حیرت نہ ہوتی۔ ہم دہلی سے تیس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں سوہنا میں گئے۔ اتنی خوبصورت اور چھوٹی سی جگہ جس کے گرد پتھریلی پہاڑیاں ہیں۔ ہم تمام کاروں سے پہلے پہنچ گئے۔ سارا دہلی وہاں آیا ہوا تھا۔ ہم نے لنچ کیا اور سینڈوچ اور بیئر کے ڈبے ساتھ رکھ لیے۔ شام کو ہم دہلی لوٹے، بدقسمتی سے نہیں جیت سکی۔ واقعی یہ ہٹلر کی ذاتی کار ہے۔ اس نے مہاراجہ پٹیالہ کو تحفہ میں دی اور موجودہ مہاراجہ نے امبر، بادل اور چیکو کے باپ ساقی کے آگے فروخت کر دی۔ مقابلے میں دوڑنے والی تمام کاریں چارمنگ تھیں۔ مجھے ایک بھی مل جاتی اور ہاں میں نے ہولی بھی زبردست منائی۔ صبح سویرے لڑکے مجھے لینے آ گئے اور پھر ہم نے باقی لوگوں کو اُن کے گھروں سے پک کیا۔ راستے میں ہم نے ہر شخص پر رنگ پھینکا اور بالکل جنگلی بن گئے۔ جیپ میں اتنے لوگ تھے کہ ایک انچ بھی جگہ خالی نہیں تھی۔ کنی اور رونو بانٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور سونی کا صرف ایک پاؤں جیپ کے اندر تھا۔ ہم جمہوریہ مصر کے سفارتخانے کے اندر چلے گئے۔ مصری سفیر اور ان کے بیوی بچے بیحد حیران ہوئے کہ اُنھوں نے ایسا

شاندار میلہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے ہماری بیشمار تصویریں اُتاریں، اور اُن کے بیٹوں نے ہمارے ساتھ ہو ہم پچھلے پہر گھر لوٹے جہاں میں نے اپنے جسم سے رنگ اتارنے کی ناکام کوشش کی۔ رات کو ہم "طبیلہ" چلے گئے جو ایک نئی ڈسکو تھیک ہے اور میری پسندیدہ۔ اسے ایک اصطبل کی طرح سجایا گیا ہے۔ ہفتے کی شب کو وہاں اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ ہمیں میزوں پر چڑھ کر ناچنا پڑتا ہے۔ اوہ کتنا لطف آیا ان سردیوں میں۔ باقی بعد میں بتاؤں گی۔

چیکو سے زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئیں۔ اِن دنوں براڈلی میں کام کر رہا ہے۔ ایک پارٹی میں ہماری زبردست لڑائی ہو گئی۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں راستے کی ڈھول نہیں ہوں اور وہ میرے ساتھ ڈھول ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ وہ ایک دم بہت اپ سیٹ ہوا اور پھر بیحد ناراض، لیکن بعد میں ٹھیک ہو گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا، کیونکہ اُسے ابھی ٹھیک طرح سے معلوم نہیں کہ وہ زندگی میں کیا چاہتا ہے۔ اُس شام جب میں واپس آئی تو وہ "طبیلہ" میں گیا اور میرے بھائی اندرجیت کو کہنے لگا، میں پریم سے شادی کر رہا ہوں، جانے کیوں؟ اندرجیت بیحد غصے میں ہے۔ وہ اس حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے چیکو سے محبت ہے۔ اُس نے مجھے ایک طویل لیکچر دیا اور کہا کہ میں چیکو سے شادی نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ صرف ایک پلے بوائے ہے۔ میری چچی کو بھی پتہ چل گیا ہے۔ اور وہ بھی یہی کہتی ہے۔ میں بیحد اپ سیٹ ہوں۔ اُس شام کے بعد میں چیکو سے نہیں ملی، چنانچہ کچھ بھی طے نہیں ہوا۔ اگر آئندہ سردیوں میں وہ میرے خاندان کی مرضی کے بغیر مجھے قبول کرنے کو تیار ہو گیا تو میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔ فی الحال میں ذہنی طور پر منتشر ہوں۔ مجھے تو چیکو کا بھی پتہ نہیں کہ وہ میرے بارے میں سچ مچ کیا محسوس کرتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی تو وہ مجھے بہت دُکھی کر سکتا ہے، اگر وہ چاہے تو۔ لیکن وہ میری کمزوری بن چکا ہے اور جانتا ہے۔ امبر کے بچہ ہونے والا ہے۔ اور ناز کے ہاں بھی، مئی میں شاید۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی ہے اور اُس کے خاوند بادل کا بُرا حال ہے۔

بادل، سگھند اور لوٹما کا بڑا زبردست حادثہ ہو گیا ان سردیوں میں۔ اگلے روز سگھند کی شادی تھی۔ یہ تینوں بہت ہی بلند قسم کے نشے میں مست سڑک کے درمیان میں پوری رفتار

سے گاڑی چلا رہے تھے۔ چنانچہ ایک گول چکر کے گرد جانے کی بجائے سیدھے گئے اور بڑا سارا
دھماکہ کر دیا۔ بادل کی اُنگلیاں ٹوٹ گئیں اور ایک دانت آدھا رہ گیا۔ وہ کمبخت اتنا مغرور
ہے کہ بجائے اس کے کہ زندگی بچ جانے پر شکر کرے اُلٹا فخر آ رہا ہے کہ اب میں مسکراؤں
گا تو میرا دانت آدھا دکھائی دے گا۔ خوش قسمتی سے سگھند کو زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ پھر بھی
شادی کی تصویروں میں اُس کا چہرہ قدرے پھولا ہوا ہے۔ مجھے اس کی بیوی بالکل اچھی
نہیں لگتی۔ کینہ پرور سی ہے۔ اب ختم کروں! پلیز جلد لکھنا۔ کیا اب تم خوش ہو؟

پریم

دوستاوسکی کو جب میں نے پہلی مرتبہ پڑھا تو ناول کے ابتدائی سو ڈیڑھ سو صفحے تو مجھے
باقاعدہ نگلنے پڑے۔ شہروں اور قصبوں کی ایک ایک اینٹ کی تفصیل، بے شمار کردار جو
ایک ایک کر کے تحریر میں سے اُبھرتے اور پھر اُن کا نام و نشان تک نہ ملتا۔ پھر آہستہ آہستہ
جب میں اُس ماحول کا ایک حصہ بن گیا، ان کرداروں کی مرغوب خوراک، اُن کے جذبوں،
نفسیاتی اُلجھنوں، نشست و برخاست کے طور طریقوں اور محرومیوں سے واقف ہوا تو
پھر دوستاوسکی کی داستان گوئی نے مجھے نگل لیا۔ ناول کے اختتام پر ایک جھلاہٹ کی سی
کیفیت طاری ہو گئی کہ یہ کردار تو بدن رکھتے تھے، جیتے جاگتے تھے۔ پھر ختم کیوں ہو گئے،
صرف کاغذ میں مقید کیوں ہیں۔ میرے چار چفیرے ہمیشہ کے لیے سانس کیوں نہیں لیتے،
وہ چھپکتے گئے۔ پریم کے اولین خط بھی ایسے ہی تھے۔ اُس کے دوست، اُس کی سہیلیاں کسی
فقرے، کسی نفرت کے اظہار، کسی پیار کے بول میں سے جھانک کر چلے جاتے اور پھر آہستہ
آہستہ ماہیپ، امیر، بادل، چیکو، اندرجیت، ونو، سگھند لفظوں کے لبادے چاک کر کے
میرے آس پاس پھیل گئے جیسے اکیس روز انڈے کے باریک چھلکے کو چونچ مار کر
چوزہ دھیرے دھیرے باہر آتا ہے اور آپ کو حیرت سے دیکھنے لگتا ہے۔ میں ایک
نظر نہ آنے والے انسان کی طرح اُن لوگوں کی پارٹیوں اور کار دوڑوں، محبتوں اور مایوسیوں
میں شامل ہو گیا۔ پریم مجھے لاہور کی گرمیوں میں سے نکال کر ڈلہوزی کی خنک بارشوں اور
دہلی کے ہڑبونگ مچاتے ہجوم میں لے جاتی۔ میں حساب لگاتا رہتا کہ ناز کے ہاں بچہ کب ہوگا،

پریم کے امتحانوں کے بارے میں فکر مند رہتا۔ میں ہٹلر کی کار کی پچھلی نشست
پر پریم کے ساتھ بیٹھا ہوتا اور خوف زدہ رہتا کہ بادل کی تیز رفتاری کی وجہ سے حادثہ نہ
ہو جائے۔ چیکو اور پریم "طبیلہ" کی میزوں پر چڑھ کر میرے سامنے رقص کرتے اور گُردوارے
بُلّے ایسی پریم ہولی کے دن مجھ پر رنگ پھینکتی۔ اُس کا ہر خط پنڈورا کے بکس کی مانند
ہوتا جسے کھولتے ہی مختلف کردار اُچھل کر باہر نکلتے اور میرے سامنے تتلیوں کی طرح
رقص کرنے لگتے۔ مگر پریم ان سے الگ رہتی، ہمیشہ ایک فاصلے پر چُپ چُپ اور میری
دسترس سے باہر، خاموش! خط ختم ہوتا تو یہ کردار اپنے لباس سمیٹتے ہوئے دوبارہ بکس میں
گھس جاتے۔

ڈلہوزی

۱۸/اپریل ۶۹ء

پیارے مستنصر!

ابھی تک مجھے نہیں لکھا تم نے! کیا تمہیں میرا آخری خط نہیں ملا؟ خدا کرے مل گیا ہو کیونکہ
وہ باقاعدہ ایک اعتبار تھا۔ اتنے عرصے سے تمہاری خبر نہیں آئی اور میں بہت اُداس ہوں۔

تمہاری پریم

مجھے اُس کا خط مل گیا تھا مگر وہ آخری نہیں تھا۔ آخری خط آیا مگر بہت بعد میں۔

۵/اگست ۶۹ء

میرے پیارے مستنصر!

مجھے تمہارے دونوں خط تو مل گئے مگر پہلے میں تمہاری تصویر موجود
نہ تھی۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو بیہودہ پوسٹل سسٹم ہے اِس کی گڑبڑ ہے۔
تصویر واقعی بھیجی تھی یا ذہنی طور پر غیر حاضر تھے؟ آج چھٹی ہے اور اس وقت اگرچہ
مجھے فرانسیسی پڑھنی چاہیے مگر فرانسیسی گئی بھاڑ میں، میں تمہیں خط لکھنا چاہتی ہوں۔
مستنصر میں کیا کروں؟ میرے گھر والے میری شادی اُسی لڑکے سے طے کر رہے ہیں،
میں جانتی ہوں کہ وہ ایک اچھا لڑکا ہے اور اس کی آمدنی بھی معقول ہے مگر یہ کوئی وجہ

نہیں کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔ نہیں کرنا چاہتی میں شادی اس کے ساتھ! اگر میں نے اُس کے ساتھ شادی کر لی تو مجھے کبھی خوشی نصیب نہ ہو گی اور نہ ہی میں اُسے خوشی دے سکوں گی۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آخر میں کتنی دیر تک اس انتظار میں بیٹھی رہوں کہ چیکو کوئی فیصلہ کرے اور میں اُس کے ساتھ شادی کروں اور اگر ہماری شادی ہو بھی جاتے تو بھی مجھے توقع نہیں کہ چیکو مجھے خوشی دے سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تین چار برسوں کے بعد پھر لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کرنے لگے گا۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ مجھے دُکھ دے گا۔ اب بھی کبھی کبھار وہ جان بوجھ کر مجھے دُکھ دیتا ہے اور اگلے روز مجھے اِتنا پیار کرتا ہے کہ میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ میں سوچنے کے قابل نہیں رہی کہ میں کیا کروں۔ تم ہی بتاؤ مستنصر، تمھارا کیا خیال ہے؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی چیکو کے ساتھ شادی کروں یا ایک طے شدہ شادی قبول کر لوں۔ میں اتنی زیادہ اَپ سیٹ ہوں مستنصر۔ ایک لمحے مَیں اس کے ساتھ شادی کرنے کا رِسک لینے پر تیار ہوں، اور دوسرے لمحے مَیں کانپ کر کہتی ہوں کہ نہیں اسے بھول جانا چاہیئے.... مگر میں اُسے نہیں بھول سکتی۔ میں اُسے پچھلے پانچ برس سے پیار کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ اس کا خاندان بالکل بکھر چکا ہے۔ والدین میں طلاق ہو چکی ہے۔ اور انھوں نے دوبارہ شادی کر لی ہے اور رہا اُس کا بڑا بھائی بادل یا تو صرف فلرٹ کر رہا ہے اور یا پھر واقعی مجھ سے محبّت کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسری بات ہے۔ اگر میں چیکو سے شادی کر لوں تو بادل مجھ سے فلرٹ کرے گا تو پھر میں کیا کروں گی۔ میری مدد کرو مستنصر! میں اتنی ناخوش ہوں۔

خیر ان سردیوں میں مَیں نے خوب لُطف اُٹھایا۔ میں چند بہت اچھے لڑکوں کے ہمراہ باہر گئی۔ ہم ہمیشہ ایک ہجوم کی صورت میں گھر سے نکلتے تھے۔ سونی، گوگی، گگوگی اور روٹو بے حد شریف اور تہذیب یافتہ لڑکے تھے۔ مجھے اتنا اچھا لگتا تھا نا کہ انسان چیکو، بادل اور رلوٹا کے بعد اتنے خوش اخلاق لڑکوں کے ساتھ باہر جائے (اُن لڑکوں نے کبھی کسی لڑکی کے لیے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی۔ درندے)

کیا میں نے تمھیں اپنی کزن کِنی کے بارے میں بتایا تھا؟ اُس کی ماں آسٹریلین ہے۔ ہم تب سے دوست ہیں جب ہم ننھی منّی بچیاں تھیں۔ دہلی میں جب کبھی کسی پارٹی سے واپسی ہوتی تو میں اُسی کے گھر سوتی تھی بلکہ صبح ۴ بجے تک ہم گپیں مارتی تھیں۔ ایک مرتبہ اُس کے والدین دہلی سے باہر گئے تو پورے ایک ہفتے کے لیے اُن کا فلیٹ اور کار ہمارے قبضے میں رہے اور ہم نے خوب عیش کی۔ وُہ اگست میں پیرس جا رہی ہے اور میں اُسے بہت مس کروں گی اور وہاں میں تین آسٹریلین لڑکیوں سے بھی ملی تھی۔ بس وہ تو یونیک تھیں۔ دو ہفتوں کے لیے انڈیا آئیں اور ڈھائی برس براجمان رہیں۔ یاسمین کا قد پانچ فٹ آٹھ اِنچ، ہیلینرا پانچ فٹ گیارہ اِنچ اور لیزا چھ فٹ دو اِنچ کی تھی (واہ واہ) وہ بڑی زبردست چیزیں تھیں۔ پارٹیوں پر اتنے پاگل کپڑے پہن کر آجاتی تھیں کہ کیا بتاؤں۔ ہر وقت پھڑکتی رہتی تھیں۔ اور جب لڑکے سُست پڑ جاتے تھے تب بھی اکیلی ناچتی رہتی تھیں۔ ہر شب کو وُہ ایک نئے لڑکے کے ساتھ باہر جائیں اور اُسی کے ساتھ سو جائیں۔ اخلاقیات کے بارے میں وہ بالکل اَن پڑھ تھیں۔ ہندوستانی لڑکیاں تو گُنگ تھیں اُن کی یہ حرکتیں دیکھ کر ہیلینز اگوگی کے ساتھ اور یاسمین اندر کے ہمراہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ دیکھی جاتی تھیں دوسرے لڑکوں کے علاوہ۔ حد یہ ہے گگوگی ہیلینز اکو نام کی بجائے "والف" کہہ کر پکارتا تھا۔ بالآخر وُہ یہاں سے چلی گئیں، لنڈن کے لیے براستہ لاہور۔ تم سے ملیں؟ میں نے اُنھیں پتہ دیا تھا۔

تم تو اتنی مشکل مشکل کتابیں پڑھتے ہو کہ میں نے تو اُن کے نام تک نہیں سُنے۔ تم سپین کے بارے میں اتنا کیوں پڑھتے ہو؟ تم سیاحت پر جانے کا سوچ رہے ہو۔ میرا بھی جی چاہتا ہے تمھارے ساتھ چلی جاؤں سپین وغیرہ۔ میں نے پاکستان تو ضرور آنا ہے کبھی نہ کبھی۔ میری شدید خواہش ہے کہ تم سے ملوں۔ تم سے ملنا کتنا عجیب لگے گا۔ کیا ہم اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے؟

میرے امتحان دو ہفتے تک شروع ہو رہے ہیں اور جب تک یہ ختم نہ ہو جائیں میں تمھیں طویل خط لکھنے سے پرہیز کروں گی۔ لیکن تم ضرور باقاعدگی سے لکھتے رہنا۔

اندر، کِنی، ماریا اور سونی یہاں آ رہے ہیں امتحانوں کے بعد۔

میرا خیال ہے اب مجھے ختم کرنا ہی ہوگا۔ میرے اِرد گرد لڑکیوں کا ایک غول ہے جو مجھے تنگ کر رہی ہیں کہ تمہارا مستنصر بالکل فیڈ اپ ہو جائے گا اتنا طویل خط پڑھتے پڑھتے۔ سچ بتاؤ کیا تم ہوئے؟ پلیز جلدی لکھنا۔

تمہاری زبردست فین

پریم!

کتنا احمقانہ خوف کہ مجھے کبھی خوشی نصیب نہ ہوگی۔

اور تم سپین کے بارے میں اتنا کچھ کیوں پڑھتے ہو؟

اور ہاں اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی پاکستان ضرور آئے گی۔ کب؟

۸-۱-۶۹

ہیلو اجنبی!

کیوں جناب آج کس سلسلے میں مجھے خط سے نوازا گیا ہے؟ کتنی خوبصورت بات کہ تمہیں اتنے عرصے بعد میری یاد آئی اور سنو میں بہت غصے میں ہوں تمہاری اس لاپرواہی کی وجہ سے جنگلی بِلّی بنی ہوئی ہوں۔ اس وقت میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اپنا غصہ بیان کرنے کے لیے۔ مجھے چاہیے کہ میں کبھی تم کو نہ لکھوں، کبھی بھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تمہاری اتنی لاپرواہی کے باوجود میں تمہیں کیوں لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ مجھے کہنا تو یہ چاہیئے کہ ہم جانے کب ملے تھے۔ کیونکہ میری یادداشت بہت مختصر ہے اور میں تمہارا نام تک نہیں جانتی...... لیکن دراصل میں کہوں گی یہ کہ میں نے تمہیں بہت مِس کیا ہے، تمہیں اور تمہارے خطوں کو۔

اور مستنصر، پچھلے چند ماہ میرے لیے ایک بوجھ تھے اور مجھے علم نہ تھا کہ میں کیسے ان میں سے گزروں گی۔ اتنے چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں اپنی عمر کا ایک برس بسر کرنا کتنا دشوار ہے۔ صرف لڑکیوں اور راہباؤں کی رفاقت میں سچ پوچھو تو میں بہت اُکتا گئی ہوں اور اب جب کہ گھر واپس جانے کا وقت قریب آ رہا ہے تو میں پھر سے وہی پُرانی وحشی لڑکی بنتی جا رہی ہوں۔ میں بائیس نومبر کو دِلی جا رہی ہوں اور یہ تمہاری بہتری

ہے کہ تم اس سے پہلے مجھے خط لکھ دو، ورنہ...... پلیز لکھ دو۔

کِنی اور لالا پے آئے تھے پچھلے ماہ۔ گھر کی بیشمار خبریں ملیں مثلاً بادل اور ناز کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے اور اُنھوں نے اُس کا نام ایک امریکی ریڈ انڈین قبیلے کے نام پر رکھا ہے یعنی شیان۔ کیا یہ اُلٹی میٹ نام نہیں؟ پتہ نہیں اس طرح کے نام کا اُس کی آئندہ زندگی پر کیا اثر ہوگا۔ چند روز پہلے بادل اور ناز ایک پارٹی میں بہت بُری طرح اُلجھ پڑے۔ بادل ذرا نشے میں تھا اور اس کو شک ہُوا کہ ناز راجو کے ساتھ فلرٹ کر رہی ہے۔ اُس نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ اس کا نیکلس ٹوٹ گیا اور تمام جواہرات فرش پر بکھر گئے۔ اُس نے اُسے مارا بھی کتنی بُری بات۔ امبر کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا ہے۔ مِنی اور پالین کا بچّہ پچھلے ماہ ہونا تھا۔ ابھی تک پتہ نہیں کیا ہُوا، یا نہیں ہُوا۔

اس وقت ”لارا کی تھیم“ بج رہی ہے اور مجھے مِنی یاد آ رہا ہے کہ ایک مرتبہ جب میں اُس کے ہمراہ رقص کر رہی تھی تو وہ غصہ دلا دینے کی حد تک مجھ سے فلرٹ کر رہا تھا۔ پہلے پہل تو میں بے حد شاکڈ ہوئی مگر میں یہ نہیں کہوں گی کہ بعد میں اُسے انجائے نہیں کیا۔ شاید اِسی لیے وُہ مجھ پر کچھ کچھ اثر انداز ہو جاتا ہے۔ بہت ہینڈسم ہے۔

کیا میں چیکو سے شادی نہیں کروں گی؟ چیکو، اس کے ساتھ شادی کرنا بہت فن ہوگا مگر ہم زیادہ دیر ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ وہ فلرٹ بہت کرتا ہے اور میں جیلس بہت ہوتی ہوں۔ ان سردیوں میں مَیں اُسے ایک فاصلے پر رکھوں گی۔ مجھے رکھنا ہوگا کیونکہ مجھے جلد ہی منگنی کروانا ہوگی۔ میں ایسے نازک مرحلے پر اس کے ساتھ جذباتی ہونا افورڈ نہیں کر سکتی۔ یعنی اس سے زیادہ جتنی کہ ہو چکی ہوں۔ ایک اور لڑکا ہے جس کے ساتھ میں شادی کر سکتی ہوں مگر وُہ جاٹ نہیں ہے اور میرا باپ اُسے ناپسند کرے گا۔ ہم کسی اور ذات میں شادی نہیں کر سکتے۔ (اور تم سکھ ہو نہیں سکتے) خیر مجھے تو فرق نہیں پڑتا چاہے لڑکا سکھ ہو یا نہ ہو لیکن مجھے داڑھیوں سے بہت وحشت ہوتی ہے۔ بالکل سیکسی نہیں ہوتیں۔

پچھلے ماہ ہم آؤٹنگ پر سرینگر گئے۔ یہ کشمیر سے میری پہلی ملاقات تھی جو فوراً ہی محبت

میں بدل گئی۔ نشاط باغ کے قریب جھیل ڈل کے اختتام پر ہم ایک گھر میں ٹھہرے ہم گلمرگ اور پہلگام بھی گئے اور بہت سی شاپنگ کی۔ ایک روز سب لڑکیاں شکارے پر سوار ہو کر نگین جھیل تک گئیں۔ یہیں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ لگا اور میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ راستہ کتنا خوبصورت تھا۔ ہم شام کو واپس آئے تو جھیل ڈل غروب آفتاب کے بعد بالکل گلابی ہو رہی تھی اس منظر نے مجھے چھوا کہیں پر۔ میرا جی چاہا کہ یہ لمحے کسی ایسے شخص کے ساتھ گزاروں جو میرے لیے اہم ہو۔ اور ہاں یہ زبردست موقع تھا سگرٹ پینے کا اور ہم نے بہت پیئے اور ہاں جس گھرانے میں ہم رہے وہ مسلمان تھا اور اب میں تمہارے طور طریقوں سے واقف ہوں۔ (کیا پتہ کب کیا ہو جائے) میں کشمیر چھوڑ کر امتحانوں کے پاس نہیں آنا چاہتی تھی مگر آنا پڑا۔ ختم نہ کروں؟ بائیس نومبر سے پہلے لکھنا۔ خدا حافظ چھوٹے بچے۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔

تمہاری

پریم

وہ پاکستان تو نہ آسکی مگر ہم نے ایک احمقانہ منصوبہ تیار کیا۔ اگر پریم دہلی سے بائی ایئر کابل چلی جائے اور میں بھی وہاں پہنچ جاؤں تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ چند روز اکٹھے گزار سکتے ہیں۔ پریم نے اس تجویز کو انتہائی سنجیدگی سے لیا اور باقاعدہ مجھ سے مشورے طلب کرنے لگی کہ جہاز سے اُترتے ہوئے کونسا لباس پہنوں اور کیا تم مجھے پہچان لوگے وغیرہ وغیرہ۔ ایک روز جب میں افغان سفارت خانے کو ویزا فارمز کی فراہمی کے لیے خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو پریم کی ایک مختصر چٹھی آگئی۔

مستنصر!

میں نے کابل میں تم سے ملنے کے بارے میں پھر سوچا ہے۔ میں نہیں آسکتی۔ میں آنا چاہتی ہوں مگر نہیں آؤں گی۔ تمہارے خطوں نے مجھے نرم کر دیا ہے اور میں پگھلنا نہیں چاہتی، ہم دونوں کسی قسم کی گڑبڑ افورڈ نہیں کر سکتے۔ کیا تم سکھ ہونا افورڈ کر سکتے ہو۔ اور پھر جیکو بھی تو ہے۔ پیار!

پریم

اسی برس ایک مرتبہ پھر میرے بدن میں خیمہ زن آوارگی کے شیطان نے مجھے ورغلایا،

میرے پاؤں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ دیوانگیٔ سفر کے موسموں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور میں اپنے چار چھیرے سے ناطا توڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وسط ایشیا اور یورپ کے ملکوں میں دھکے کھاتا سپین میں وارد ہوا۔ سپین کی سیاحت کے اختتام پر میں نے علی کانت سے بارسلونا تک ساحلی سڑک پر سفر کیا۔ میری بس کے دائیں بائیں سپورٹس کاریں شرلاٹے بھرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ بارسلونا ایک سانولا سلونا شہر ہے۔ پُرکشش اور سمندری ہوا سے نمکین۔ اس کی سڑک "لارامبلا" پر صرف پھولوں کی دکانیں ہیں شوخ رنگ اس قدر دہکتی ہوئی کہ جیسے بارسلونا میں آگ لگ گئی ہو۔ مجھے پریم کا خیال آگیا جسے میں نے وطن چھوڑنے سے پیشتر روانگی کی اطلاع بھی نہ دی تھی۔ میں نے ایک تصویری پوسٹ کارڈ خریدا اور ڈلہوزی کے پتے پر روانہ کر دیا۔ پوسٹ کارڈ پر آتشی رنگوں کے سلگتے ہوئے پھول تھے اور اُن کے درمیان میں لکھا تھا

ایک نارمل قسم کا پوسٹ کارڈ جو غیر ملکوں میں چھٹیاں منانے والے لوگ وطن میں مشقت کرتے ہوئے دوستوں کو صرف جلانے کے لیے بھیجتے ہیں۔ صرف جلانے کے لیے۔

اسی دوپہر جب میں اپنی ڈاک وصول کرنے تھامس کک کے دفتر گیا تو دوستوں اور بھائی بہنوں کے خطوط میں ایک لفافہ ایسا بھی تھا جس پر ڈلہوزی کی مہر لگی تھی اور پریم کی تحریر تھی۔

ڈیئر مستنصر!

یہ مکمل درندگی کی انتہا ہے کہ تم مجھے بتائے بغیر پاکستان سے چلے گئے ہو۔ اتنی دور کہ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں تمہیں کتنا مس کرتی ہوں۔ تم کب واپس آرہے ہو؟ جلدی آجاؤ۔ شاید میں بیوقوف ہوں یا شاید نہیں ہوں، اس لیے کہ تم لاہور میں ہو یا بارسلونا میں۔ مجھے تو اس سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ مگر مجھے اطمینان جب ہی ہوگا جب تم واپس آجاؤ گے۔

اور ہاں یہ تمہیں سپین سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ میں جلتی ہوں سپین سے (اس لیے کہ یہ تمہیں پسند ہے)

میں نے اپنے چند خطوں کا جواب نہ پاکر تمھاری بہن شائستہ کو خط لکھا جس نے مجھے تمھارا بارسلونا کا پتہ بھیج دیا۔

بارسلونا کیسا شہر ہے؟ میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام سُنا ہے۔ پیار!

پریم

میں جلتی ہوں سپین سے۔

بارسلونا کیسا شہر ہے؟ میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام سُنا ہے۔

وطن واپسی پر لٹریچر کے لالچی کیکڑے نے اپنی ٹانگیں سفرناموں، افسانوں اور ناولوں کی صورت میں میرے بدن پر اس طرح لپیٹ دیں کہ میں پریم کے باقاعدہ خطوط کے جواب میں کبھی کبھار ہی قلم اُٹھاتا۔ کچھ عرصے بعد اُس نے ایک مختصر خط میں مجھے اطلاع دی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ چنکو کے ساتھ یا اُس لڑکے کے ساتھ جو کہ سکھ ہے اور جاٹ ہے اور اس کے والدین کی پسند ہے۔ میں نے اُسے مبارکباد کا ایک کارڈ روانہ کر دیا۔ پھر وُہ خاموش سی ہو گئی۔ میں تو غافل تھا ہی۔ میں نے اُس کی تحریر کو مِس نہیں کیا۔

ایک روز ارشد میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا "پریم کیسی ہے؟ تو مجھے یاد آیا کہ اُس کا آخری خط آئے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا۔ میں نے اسی وقت اپنے تئیں ایک نہایت چُبھتا ہُوا خط لکھا کہ میرا نام یہ ہے اور پتہ یہ ہے اور ہم کسی زمانے میں دوست ہُوا کرتے تھے۔ وہ خاموش رہی۔ دو برس اور بیت گئے۔

۱۹۷۵ء میں میرے پاؤں کے تلوے پھر آبلوں کے لیے ترسنے لگے۔ میں نے گھر والوں کی منت سماجت کر کے آخری مرتبہ سفر پر جانے کے لیے اجازت مانگی۔ خیر اجازت تو نہیں مانگی یکطرفہ طور پر فیصلہ دے دیا کہ میں جا رہا ہوں اُمید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ روانہ ہونے سے پیشتر میرا جی چاہا کہ میں پچھلی مرتبہ کی تلافی کر دوں اور پریم کو روانگی کی اطلاع کر دوں۔ میں نے اُسے لکھا کہ میں سفر پر جا رہا ہوں مگر فکر نہ کرو اس مرتبہ سپین نہیں جا رہا جس کے نام سے تم جل جاتی ہو۔ اور اگر تمھاری شادی ہو چکی ہے

اور تم نے بہت سارے بچے پیدا کر لیے ہیں تو اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے خط بھی نہ لکھو۔ تم نے خود ہی تو وعدہ کیا تھا کہ شادی کے بعد بھی ہم دوست رہیں گے وغیرہ وغیرہ۔

برگمان کی ایک فلم تھی "دی سیونتھ سیل" ایک نائٹ صلیبی جنگوں سے واپس آ رہا ہے، وطن کی جانب۔ ایک تپتی اور سنسان دوپہر میں وہ کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر چل رہا ہے، جَو کی بالیاں گرمی کی شدت سے سنہری ہو کر چار چفیرے سنسا رہی ہیں، صرف یہی سنسناہٹ ہے، صرف وہی نائٹ ہے، اور کوئی آواز نہیں، اور کوئی بشر نہیں، نائٹ دیکھتا ہے کہ دُور کھیتوں کے درمیان ایک زرد رُو سیاہ پیکر کھڑا ہے "میں موت ہوں" قریب آتا ہُوا سیاہ پیکر کہتا ہے "اور میں تمھاری جان لینے آیا ہوں خدائے ذوالجلال کے حکم سے"۔ نائٹ اُسے بحث میں اُلجھا لیتا ہے کہ میں نے مذہب کی خاطر وطن سے دُور جا کر اپنی جان کو خطرے میں ڈالا، اور جبکہ میری جلاوطنی ختم ہونے کو ہے خدا کو میری خدمات کا یہ صلہ نہیں دینا چاہیئے۔ سیاہ پیکر کہتا ہے "میں حکم کا تابع ہوں۔ بحث کی گنجائش نہیں"۔ اس پر نائٹ جو کہ شطرنج کا ماہر ہے تجویز پیش کرتا ہے کہ آؤ ہم ہر شام شطرنج کی بازی لگاتے ہیں، اگر میں ہار جاؤں تو بیشک میری رُوح قبض کر لینا۔ سیاہ پیکر اپنی زرد مسکراہٹ کے ساتھ حامی بھر لیتا ہے۔ ہر شام بازی لگتی ہے۔ اور ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوتا اور ہو سکتا بھی نہیں کہ نائٹ ایک ایسی چال چل چکا ہے کہ اب وہ شکست نہیں کھا سکتا۔ پھر ایک سفر ہے سنسان لینڈ سکیپ اور اُجڑے ہوئے قصبوں اور تپتے ہوئے ویرانوں کا۔ نائٹ چل رہا ہے اور کچھ فاصلے پر سیاہ پیکر اُس کے تعاقب میں۔ انسان چل رہا ہے اپنی ناقابلِ شکست چال کے تجربے میں اور کچھ فاصلے پر موت کہ وہ برحق ہے اُس کے تعاقب میں۔ اور بالآخر...... میرا سفر بھی کچھ کچھ اُس نائٹ سے مشابہت رکھتا تھا۔ زرد رُو پیکر کے سیاہ سائے ہمہ وقت میرے تعاقب میں رہے، مجھے زیر تو نہ کر سکے مگر میرے تعاقب میں رہے۔ افغانستان، ایران، ترکی اور لبنان میں اُنھوں نے میرے لبادے کو گرفت میں لیا مگر میری خوش بختی نے اُن کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ طاری کر دی اور میں بچ نکلا۔ مگر سوئٹزرلینڈ میں...... اُس نکھرے ہوئے

خطے پر ایک چمکیلی صبح کو میں نے اپنے چچا کو برمنگھم فون کیا تاکہ اپنی آمد کی پیشگی اطلاع کر سکوں۔ اُن کی بیٹی نے فون اُٹھایا۔

"مستنصر بول رہا ہوں، سوئٹزرلینڈ سے......"

"جی بھائی جان......" صرف اتنا کہا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"خالدہ......کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے بھائی جان......ساجد بھائی شہید ہو گئے ہیں۔"

کوئٹہ کی وُہ صبح بھی ایسی ہی ہو گی قدرے خنک اور چمکیلی جب کیپٹن ساجد نذیر نے اپنے فوجی جہاز کے پہیوں کو زمین کی گرفت سے علیحدہ کیا۔ چند سو گز اُڑ جانے کے بعد زمین پر کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ جہاز واپس آ رہا ہے اور پھر اُس کا ڈھانچہ اُن کے سامنے جل رہا تھا۔ ساجد کو جلتے ہوئے جہاز کو توڑ کر نکالا گیا تو وہ ہوش میں تھا۔ اُس نے سٹریچر پر لیٹنے سے انکار کر دیا اور خود چلتا ہوا اپنی جیپ تک گیا۔ جیپ کو ڈرائیو کر کے ہسپتال پہنچا۔ طویل سیڑھیاں طے کیں اور ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگا "ڈاکٹر میں شدید درد محسوس کر رہا ہوں مجھے کوئی انجکشن لگا دو۔" اُس کے چوڑے کندھوں پر سجی خاکی وردی سُلگ رہی تھی، سیاہ ہو رہی تھی۔ جسم کا نوّے فیصد حصّہ جل چکا تھا۔ جلتے ہوئے جسم کو سب سے بڑا خطرہ سیپٹک ہو جانے کا ہوتا ہے چنانچہ ساجد کے بستر کے گرد پالی تھین کا ایک خیمہ نصب کر دیا گیا۔ اُس نے نرس سے کہا "تمہیں پتہ ہے میں ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے باپ کا بھی کوئی بھائی نہیں۔ میری ماں لاہور میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے کہ میں اگلے ہفتے چھٹی پر جا رہا تھا۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا کوئی سگا بھائی نہیں.....ہاں خالہ زاد ہیں بہت سارے.....میرے ایک بھائی جان ہیں جنھیں سیاحت کا جنون ہے......وُہ ان دنوں یورپ گئے ہوئے ہیں......" اور بالآخر......لانبے قد اور گھنگریلے بالوں والا میرا ساجد جس کی شرارتی آنکھیں اور ڈیشنگ شخصیت دیکھ کر مجھے زارِ روس کی فوج کے گھڑسوار بیباک افسر یاد آ جاتے تھے، سیاہ پیکر کے آگے بازی ہار گیا۔ بازی میں نے لگائی تھی اور ہار ساجد گیا۔ زرد رُو پیکر نے اُس کا ہاتھ تھاما اور ہم سے دُور لے گیا۔

میں نے خواب آور دوائیوں کے بوجھ تلے دبے ایک مریض کی طرح یورپ اور ایشیا کی وسعتوں کو پار کیا تاکہ میں ساجد کے چالیسویں پر وطن پہنچ سکوں، اُس کی مٹی پر گھاس اُگنے سے پہلے ہیں ایک اُجڑے ہوئے گھر میں داخل ہُوا تو میرے والد زندگی میں پہلی بار میرے گلے لگ کر روئے۔ اُس رات میری بیوی مجھے اُس کے جانے کی، اُس کے زمین میں اُترنے کی تفصیلات بتاتی رہی اور ہم روتے رہے۔ دوسری صبح جب ہم چالیسویں میں شرکت کے لیے ٹرین میں ساجد کے گاؤں جا رہے تھے تو چپ بیٹھی ہوئی مُونا نے ایک دم کہا "وہ پریم بھی مرگئی ہے۔"

"کونسی پریم؟" میرے شل ہوتے ہوئے ذہن پر کوئی تصویر نہ اُبھری۔

"وُہی آپ کی قلمی دوست......سِکھ لڑکی۔"

مگر میں اُس وقت کچھ بھی سوچ نہ سکتا تھا......پریم مرگئی ہے تو کیا ہُوا.....کونسی پریم......پتہ نہیں کونسی پریم......

پورے دو ماہ کے بعد جب ہم لوگ زیرِ زمین جانے والے کے لیے آنسوؤں کا ذخیرہ ختم کر چکے تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا "اُس روز ٹرین میں تم نے پریم کا ذکر کیا تھا" وُہ اُٹھی اور الماری کھول کر ایک خط مجھے تھما دیا۔

۲۳۔ بڑا کھمبہ روڈ۔ نیو دہلی۔

محترم مستنصر!

آج صبح کی ڈاک میں میری اکلوتی بہن پریم کے نام ایک خط تھا۔ میں نے وُہ خط کھول لیا۔ کیونکہ پریم اُسے نہیں کھول سکتی۔ وُہ مر چکی ہے۔ لفافے پر اُس کا نام دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ کون لاعلم شخص ہے جسے یہ معلوم نہیں کہ وُہ آج سے تین برس پہلے کی مر چکی ہے۔ میں نے اُس کا نام دیکھ کر آج اپنی کھوئی ہوئی بہن کے لیے پھر سے آنسو بہائے۔ وُہ اکثر آپ کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ اس لیے میں مختصراً اُس کے چلے جانے کا احوال لکھتا ہوں۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ اُس کی منگنی ہو گئی تھی اور وُہ چند ہفتوں تک بیاہی جانے والی تھی۔ شادی سے پیشتر وہ اور اُس کا منگیتر شاپنگ کے لیے یورپ گئے۔ واپسی پر فرانس

میں پریم نے ضد کی کہ وہ سپین دیکھے بغیر گھر نہیں لوٹے گی۔ وہ سپین گئے اور علی کانت سے بارسلونا جانے والی ساحلی سڑک پر ان کی تیز رفتار سپورٹس کار کا حادثہ ہو گیا۔ کار پریم چلا رہی تھی۔ وہ شدید زخمی ہوئی مگر اس کا منگیتر بچ گیا۔ نزدیک ترین ہسپتال بارسلونا میں تھا جہاں پریم کو داخل کروا دیا گیا۔ اس کی چند ہڈیاں ٹوٹی تھیں اور چہرے پر زخم آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ مسلسل طبی نگہداشت کے ساتھ چار پانچ ماہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اس کا منگیتر اس کے پاس ٹھہرا رہا مگر اسے کاروباری مصروفیات کی بنا پر چند ہفتوں کے لیے ہندوستان واپس آنا پڑا۔ ایک رات پریم سوئی ہوئی تھی کہ اُسے خنکی کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دیر تو پہلو بدلتی رہی مگر سردی کی کاٹ نے اُسے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وُہ کمرے میں نصب گیس ہیٹر کے پاس آئی اور اُسے جلانے کے لیے ماچس کی تیلی روشن کی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اُسی لمحے پریم کمرے کے درمیان کھڑی مشعل کی طرح جلنے لگی۔ وہ ایک دہشت زدہ جانور کی مانند گم سم وہیں کھڑی جلتی رہی اور بالآخر تکلیف کی شدت سے مجبور ہو کر چیخیں مارنے لگی۔ جب تک لوگ مدد کو آئے وُہ جلتے جلتے سیاہ ہو چکی تھی۔ گیس ہیٹر میں خرابی تھی اور اُس میں سے گیس لیک کرتی تھی۔ جب پریم ہیٹر جلانے کے لیے بستر سے اُٹھی تو پورا کمرہ گیس سے بھرا ہوا تھا۔

جونہی مجھے یہ دہشتناک خبر ملی میں فوراً بارسلونا روانہ ہو گیا۔ انھوں نے پریم کو پالی تھین کے بنے ہوئے ایک خیمے میں رکھا ہوا تھا (جلے ہوئے جسم کو سب سے بڑا خطرہ سیپٹک ہو جانے کا ہوتا ہے) اُس کا جسم سیاہ پڑ چکا تھا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری بہن بہت لمبے قد کی تھی اور وہاں اُس بستر پر پڑی، ماس کے تقریباً بغیر وہ بہت ہی بھیانک لگتی تھی۔ مگر وُہ بول سکتی تھی۔ اُس کے خیمے میں ایک فون تھا اور دوسرا ادھر میرے قریب میز پر رکھا تھا۔ ہم پہروں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے اور فون پر باتیں کرتے رہتے۔ اُس نے آپ کے بارے میں بھی باتیں کیں (مستنصر نے مجھے بارسلونا سے
کا کارڈ بھی بھیجا تھا۔ میں یہاں آ تو گئی مگر معلوم نہیں کہ کس حالت میں۔ وُہ اس شہر میں گھومتا رہتا تھا۔ شاید ہسپتال کے اس کمرے کے نیچے سے بھی گزرا ہو مجھے پہلی بار بارسلونا کا نام

تب معلوم ہوا جب میں نے اُسے یہاں خط لکھا تھا) پریم شدید اذیت میں تھی مگر وُہ مسکراتی رہتی تھی اور باتیں کرتی رہتی تھی۔ اُس کے درجنوں آپریشن کیے گئے تاکہ جلے ہوئے حصوں پر سرجری کی جا سکے مگر دن بدن اس کا وزن کم ہوتا گیا...... یہاں تک کہ اُس کے بستر پر لمبے قد کا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا۔ مگر وُہ بول سکتی تھی۔ انہی دنوں مجھے ایک اشد کاروباری ضرورت کے تحت دو روز کے لیے دہلی واپس آنا پڑا، اور گھر پہنچتے ہی مجھے ہسپتال کی طرف سے تار ملا کہ پریم اُسی رات مر گئی تھی۔

میں بارسلونا گیا اور اُسے دہلی لے آیا۔ یہاں جیسا کہ ہم میں رواج ہے ہم نے اُسے جلا دیا۔

میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو جڑواں بچے ہیں۔ میں کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر دہلی سے باہر رہتا ہوں۔ آپ پریم کے دوست تھے۔ اگر آپ مجھ سے رابطہ رکھیں تو میں شکرگزار ہوں گا۔ کبھی دہلی تشریف لائیں تو مجھے اور میری بیوی کو بیحد خوشی ہو گی۔

آپ کا

اندرجیت

پریم کی احمقانہ خواہش پوری ہوئی۔ آج اُس کی موت کے چھ برس بعد وہ بائیس برس کی ہے۔ وہ بائیس برس کی ہی رہے گی۔ اُس نے کہا تھا ناں کہ کاش انسان ہمیشہ ایک ہی عمر کا رہے۔

درخت

کلہاڑے کا لشکتا پھل درخت کی چھال کو چیرتا ہوا سفید گودے میں گھب گیا۔ یہ پہلی ضرب تھی۔

لکڑہارے نے ہتھیلیوں پر تھوکا اور دستے کو مضبوطی سے تھام کر اسے درخت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا...... بازوؤں میں اتنی طاقت نہ تھی۔

اُس نے آسمان کی جانب دیکھا جیسے غیبی مدد کا منتظر ہو اور پھر زور لگایا...... مگر ناکام رہا۔

تیسری مرتبہ اس نے اپنی تمام ترکمینگیوں اور بدعہدیوں کو یاد کیا اور پھر دستے کو کھینچا لشکتا ہوا پھل باہر تو آ گیا مگر وہ کُند ہو چکا تھا۔

لکڑہارے نے اس مرتبہ ہتھیلیوں پر تھوکنے کی بجائے نفرت سے دھرتی پر تھوکا اور دانت پیستے ہوئے کلہاڑا بلند کر دیا۔

ندی کے کنارے زمین کا یہ ٹکڑا عرصے سے بنجر پڑا تھا۔ بیشمار قدیم درختوں سے

گھرا ہوا مگر بنجر، وہ قدیم درخت ہمیشہ سے وہاں تھے مگر حیرت کی بات تھی کہ ان کی جڑیں زمین کے اندر نہیں تھیں زمین کے اوپر اوپر پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ پرانے درخت اپنا محلِ وقوع بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ ہوا کے رُخ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اُسی جانب کھسکتے رہتے ہیں۔ جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوں تو کھسکنے میں کتنی آسانی رہتی ہے۔ جہاں بارش کا امکان ہوتا، ان کی زبانوں کی لالچی شاخیں اُدھر کو پھیلنے لگتیں۔ ان میں ایک دو درخت ایسے بھی تھے جو اپنے مقام پر تھمے رہتے۔ ہوا کا ساتھ نہ دیتے مگر خوف کی بناء پر، پیرانہ سالی کی وجہ سے سبھی درختوں کی ٹہنیاں عمر رسیدہ ہونے کے باعث ٹیڑھی ہو چکی تھیں۔ پتوں میں بیماریوں نے سوراخ پیدا کر دیئے تھے، اور اُن کے کنارے مُڑے مُڑے تھے۔ ڈالیوں پر حشرات الارض رینگتے رہتے۔ ان کے تنے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ چھاؤں بھی چھدری تھی۔ اگر کوئی مسافر اُن کے سائے تلے بیٹھتا تو تھوڑی دیر بعد اپنے اُوپر گرنے والے کیڑوں مکوڑوں اور بالوں پر پڑتے گھن کے برادے سے تنگ آ کر خود ہی چلا جاتا۔ مگر پھر بھی ان درختوں کو زعم تھا کہ وہی دراصل اس خطے کو دُھوپ اور بارشوں سے بچائے ہوئے ہیں۔ پھر اُن درختوں کے درمیان میں واقع اُس بنجر ٹکڑے میں سے ایک کونپل پھوٹی، دنوں میں ایک ننھے منے پودے میں بدل گئی تب اُس کی شناخت ہوئی۔ یہ پودا سفیدے کا تھا، تمام لوگ جانتے ہیں کہ سفیدے کا درخت تیزی سے بڑھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے جنگل پر حاوی ہو جاتا ہے اور اُس کی جڑیں زمین میں دُور تک چلی جاتی ہیں۔ اور اُس کے تنے میں خوشبو ہوتی ہے اور وہ بے حد پُروقار اور خوبصورت ہوتا ہے۔ بوڑھے درخت اس نووارد سے بے حد حسد کرتے تھے، اتنی تیزی سے نشوونما پانا ان کے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ سفیدے کی چھاؤں اتنی گھنی نہیں ہوتی مگر پھر بھی ندی کو پار کرنے والے مسافروں کی اکثریت اس کے سائے تلے آرام کرتی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اُن کے جسم کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہتے اور دوسرے وہ اس کی خوشبو اور خوبصورتی کے جادُو میں وہاں بیٹھے رہتے۔ سفیدے کا درخت قدرے مغرور بھی تھا اور وُہ اپنے حُسن کے

تجربہ بعض اوقات مسافروں کی نفرت بھی مول لے لیتا مگر بعد میں وہ اسے معاف کر دیتے۔ اب بوڑھے درخت دانت پیسنے خاموش بیٹھے رہتے۔ کوئی بھی ان کے قریب نہ جاتا۔ پھر ندی میں سیلاب آیا اور درخت اپنی جگہ پر جما رہا۔ مگر بیشتر پرانے درخت ٹوٹ پھوٹ گئے اب ان کے درمیان حسد کا رشتہ ٹوٹا اور نفرت اور ضد کا الاؤ بھڑکنے لگا۔

اسی دوران اُدھر سے اُس کا گزر ہوا۔

اُس کے کاندھے پر ایک کلہاڑا تھا لشکتے ہوئے پھل والا۔ کلہاڑے کی دوسری ضرب سے درخت کے پتوں میں خفیف سی بے چین حرکت ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے تنے پر وار ہوا ہے۔ جڑوں کو بھی خبر ہوئی کہ تازہ ہوا سے رابطہ کٹ رہا ہے۔ اب سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔

"........اس درخت کو مت کاٹو........" لکڑہارے کے نوجوان معاون نے دستے پر ہاتھ جما کر درخواست کی۔

"ہونہہ" لکڑہارے نے تکبّر سے دھرتی پر تھوکا اور گردن اُونچی کر کے سفیدے کی بلند ترین شاخوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کی نظر دھندلا گئی۔ "اِس کے پتّے کھجور کی طرح زمین سے بہت دُور ہیں۔ ان کی چھاؤں چھدری اور ہلکی ہے۔ مسافر صرف اس کی خوبصورتی اور تنے سے نکلنے والی خوشبو سے مسحور ہو کر اِس کے نیچے بیٹھے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے دھوپ کی شدّت سے پہلے بھی سیاہ تھے اور اب بھی ہیں۔ اس درخت نے انھیں کیا دیا ہے۔ ہاں دھوپ سے بچانے کا سراب دکھایا مگر بچایا نہیں۔ میں اسے کاٹ دُوں گا۔"

"بابا کم از کم اس کی شاخوں میں سے کیڑے مکوڑے مسافروں پر نہیں گرتے۔ انھیں یہ بھی یقین ہے باطل ہی سہی کہ یہاں پر گر کر انھیں کچلے گا نہیں۔"

"میں اس کی جگہ نئے درخت لگاؤں گا۔"

"مگر ہم لکڑہارے تو صرف درخت کاٹتے ہیں لگاتے نہیں۔"

اُس نے جواب دینے کی بجائے کلہاڑا بلند کیا اور "درخت" کے تنے میں اُتار دیا۔

شام ہو گئی مگر درخت گرا نہیں۔

دوسری صبح ندی پار کرنے والے پہلے شخص نے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا تہمند سر سے اتارا اور اُسے کمر کے گرد کس لیا۔ بغل میں دبی جُوتی نکال کر پہنی اور ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ "درخت" کے تنے میں ایک گہرا زخم تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی اس کے اندر رکھ دی۔ زخم گہرا تھا مگر وہاں خون نہ تھا صرف ٹھنڈک اور اطمینان تھا۔ "اِسے کون کاٹ رہا ہے؟" وہ منزل کی جانب روانہ ہونے کی بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ دوسرا شخص آیا تو پہلے شخص نے اُسے درخت کے گھاؤ کے بارے میں بتایا، وہ بھی وہیں براجمان ہو گیا۔ جب لکڑہارا اپنے کلہاڑے کو ساری رات تیز کرنے کے بعد واپس آیا تو وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ لشکتا پھل فضا میں اُٹھا تو کسی ہاتھ نے دستے پر اپنا بوجھ ڈال دیا۔

"تم کون ہو؟"

"ہم مسافر ہیں۔ اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں......اور تم؟"

"میں لکڑہارا ہوں۔ اس درخت کو کاٹ کر اس جگہ نئے درخت لگانا چاہتا ہوں۔"

"مگر لکڑہارے صرف درخت کاٹتے ہیں لگاتے نہیں۔"

"تم دیکھ لو گے کہ یہ لکڑہارا درخت لگاتا بھی ہے۔"

"مگر اس عمل میں تو برسوں لگ جائیں گے تب تک ہم کہاں ستائیں گے۔"

"گھنی چھاؤں کی اُمید میں چند برس انتظار بھی تو کیا جا سکتا ہے۔"

"اُن چند برسوں میں ہم شاید نہ رہیں......ہم تمھیں اسے کاٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"اِس درخت اور میرے کلہاڑے کے درمیان جو شے حائل ہوتی ہے کٹ جاتی ہے۔" مسافروں کے ہاتھ خالی تھے، اُنھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور لکڑہارا "درخت" پر وار کرنے لگا۔ بالآخر بلندی پر تالیاں بجاتے پتّے اور زمین میں دُور تک اُتری ہوئی

جڑوں کے درمیان صرف ایک رگ باقی رہ گئی۔

لکڑہارے نے دھرتی پر تھوکا اور اپنے کلہاڑے سے اُس رگ کو بھی کاٹ دیا۔

درخت ترچھا ہُوا، دھرتی کا رُخ کیا اور گرنے لگا اور رنیچا ہُوا، اور ہوا کے رُخ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زمین کی جانب جُھکتا چلا گیا...... اور پھر اُس کے گرنے کی آواز پورے جنگل میں چیختی ہوتی چھا گئی۔ مسافروں نے حیرت سے دیکھا، وہ درخت' دیکھنے میں اتنا بلند نہیں لگتا تھا مگر اب تو وہ جنگل کے اس سرے سے لے کر دوسرے سرے تک قدیم درختوں کو کچلتا ہوا اُن پر لیٹا تھا۔ مسافر اپنے محنتی ہاتھوں کے پیمانوں سے اُس کی لمبائی ماپنے لگے' (درخت کی بلندی صرف اس کے گرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے) اور پھر ماتم کرنے لگے۔

لکڑہارے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے آخری ضرب تو لگائی مگر اس کے بعد وہ کہاں گیا کسی کو معلوم نہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اور ان میں لکڑہارے کا نوجوان معاون بھی شامل ہے کہ جب بلندی پر تالیاں بجاتے پتّوں اور زمین میں دُور تک اُترتی ہوئی جڑوں کے درمیان صرف ایک رگ باقی رہ گئی تو یک دم لکڑہارے کی ہمّت جواب دے گئی۔ وہ چلا گیا اور آہستہ آہستہ درخت کے گہرے زخم بھر رہے ہیں۔ کیونکہ جس وجود کی جڑیں زمین میں دُور تک پھیلی ہوں زمین اُسے کبھی اپنے سے جُدا نہیں کرتی۔ (۱۹۷۸ء)

بابا بگلوس

گرمی سے پگھلے ہوئے شہر کی اُبلتی رات میں ایک بدن کو نچوڑ کر یخ کر دینے والی چیخ کا گرم سیسہ کانوں میں اُترا۔ بابے بگلوس نے کروٹ بدلی۔ ایک اور چیخ کا گرم پتھر اس کی کھوپڑی پر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی چیخوں کے دہکتے اولے اس کے بدن پر برسے۔ کیا مصیبت ہے۔ عمارت کے اہلِ کار آخر رات کے وقت ہی کیوں اقبالِ جرم کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنھیں معلوم نہیں کہ بابا بگلوس سونا چاہتا ہے۔ وہ شب کروٹیں بدلنے میں ہی گزری۔

"عنایت پُتّر! بڑی سرکار نے تو رات بھر سونے نہیں دیا" دھوپ کے پہلے برچھے زمین میں کُھبنے سے پیشتر بابے بگلوس نے اپنی چارپائی کوٹھڑی میں سے برآمدے میں گھسیٹی اور نل پر منہ ہاتھ دھوتے سپاہی سے شکایت آمیز بوڑھے لہجے میں کہا۔

عنایت مسواک منہ سے نکال کر ایک لمبی تھوک کر کے بولا "بابا بڑی سرکار تو دورے پر گئی ہوئی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بابے نے بے یقینی میں سر ہلایا "ساری رات چیخوں کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ ایسی خوفناک چیخیں جو صرف بڑی سرکار کا چھتر ہی انسانوں کے تمام سوراخوں میں سے باہر نکالتا ہے۔"

عنایت نے پانی کی ڈبک منہ میں اُنڈیل کر تھوتھی آسمان کی جانب کر دی اور اس کے حلق میں سے گر گر کی آوازیں آنے لگیں جیسے موٹر سائیکل کا پلگ شارٹ ہو جائے تو انجن ہُرک ہُرک کر چلتا ہے۔

"سچ کہہ رہا ہوں عنایت ساری رات ......" بابا بدستور سر ہلاتا رہا۔

"وہ چیخیں اس عمارت میں سے نہیں آ رہی تھیں بابا۔ اور ویسے بھی ہمارے خاص کمرے تو ساؤنڈ پروف ہیں۔"

"میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" بابے نے جھلّا کر کہا۔

"گرمی مت کھایا کرو بابا۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے چیخوں کی آوازیں سُنی نہیں ......" عنایت ہنسنے لگا اور پھر آنکھ مار کر بولا "دراصل تمھیں سمت کا اندازہ نہیں ہو سکا چیخوں کی آواز آ رہی تھی مگر اس عمارت میں سے نہیں بلکہ باہر شہر کی طرف سے۔"

"شہر کی طرف سے؟"

"ہاں اب چیخوں کی آوازیں اُدھر سے ہی آیا کرتی ہیں۔"

"کوئی نیا بندی خانہ کُھل گیا ہے؟"

"کوئی ایک ......" عنایت نے مسواک منہ میں ٹھونسی اور اپنی بیرک میں چلا گیا۔ بابے بگوس نے اپنا سفید بگلا سر کھجلایا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈربہ نما تنگ کوٹھڑیوں، بیرکوں، دفتروں، تہ خانوں اور اُونچی اُونچی دیواروں

میں گھرے چوکور صحنوں کا یہ مجموعہ شہر سے باہر ایک تاریخی عمارت کے ایک ایسے کونے میں پوشیدہ تھا جس کے پہلو میں لیٹی ہوئی سڑک پر سے گزرتے سیاحوں اور عام شہریوں کو یہ گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ وہاں موجود ہے، اور وہ وہاں موجود تھا۔ لوگ پکنک کی ٹوکریاں اُٹھائے، کیمرے لٹکائے صرف بلند دیواروں کو دیکھ پاتے اور ماضی کے بادشاہوں کی عظمت کا دباؤ سینے پر محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ یہ عمارت باقاعدہ قسم کا قید خانہ نہیں تھی، مجرموں کو صرف عارضی طور پر یہاں لایا جاتا تھا۔ صرف ایسے مجرم جن کے جرم کا حوالہ دُنیا کی کسی قانونی کتاب میں نہیں ملتا تھا۔ آغاز بڑی سرکار کے چھتر سے ہوتا جو اُن کو ہموار کرتا اور پھر جدید ترین درآمد شدہ آلات ان کے جسموں پر باندھ کر یا اُن کے سوراخوں میں فٹ کر کے اُن سے اقبالِ جرم کروا لیا جاتا۔ بیشتر قیدی اپنے جرم کی اُس تفصیل پر فوراً دستخط کر دیتے جو بڑی سرکار کی بڑی سرکار نے بھیجی ہوتی تھی۔ مگر کچھ کُند ذہن اِن آلات میں جکڑے ہوئے سپورٹس مین سپرٹ کو بالائے طاق رکھ کر یونہی مر جاتے اور پھر اُن کی لاشیں بلند دیواروں سے پھینک کر اعلان کر دیا جاتا کہ انھوں نے خودکشی کر لی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اتنی کُند ذہنیت کا مظاہرہ خودکشی ہی تو ہے جب کہ صرف دستخط کرنے سے انسان زندہ رہ سکتا ہو۔

یہ عمارت ایک عرصے سے یہاں موجود تھی۔ حزبِ مخالف کے سیاسی راہنما جب ان کوٹھڑیوں میں لائے جاتے تو وہ برف کی سِلوں پر بندھے ہوئے خلوصِ دل سے تہیہ کر لیتے کہ جونہی حکومت کی باگ ڈور اُن کے ہاتھوں میں آئے گی وہ اس منحوس عمارت کو ڈھا کر یہاں پر ایک عمدہ قسم کا چلڈرن پارک بنوا دیں گے۔ مگر جب بھی ایسا ہوتا یعنی اُن کی پیٹھیں برف کی سِلوں کی بجائے کرسیٔ اقتدار پر جمتیں تو چلڈرن پارک کے لیے کوئی اور جگہ تلاش کر لی جاتی اور یہ عمارت نظریۂ ضرورت کے تحت اُسی طرح اُسی بڑی سرکار کے زیرِ نگرانی موجود رہتی کہ ہر حکومت کی ڈور پر کانٹیاں ڈالنے والے بھی موجود ہوتے اور اُنھیں سیدھا کرنے کے لیے اس عمارت کا وجود رہتا۔ کہنے کا مطلب

یہ ہے کہ یہ عمارت موجود تھی، اب بھی ہے اور تب تک رہے گی جب تک کہ ایک ایسی نسل سامنے نہیں آجاتی جو سات کروڑ ننگے پاؤں اور چیتھڑوں میں ملبوس فاقہ زدہ بچوں کے لیے سچ مچ ایک عظیم چلڈرن پارک نہیں بنا دیتی۔ ہاں تو مجرموں کو یہاں صرف عارضی طور پر لایا جاتا اور وہ چند روز یہاں خون تھوک کر یا اپنا ایک آدھ عضو ناکارہ کروانے کے بعد یا بالکل ہی فوت ہو جانے کے بعد یہاں سے باہر چلے جاتے مگر بابا بگوس یہاں ہمیشہ سے رہتا تھا۔

محکمۂ سیاحت کا ایک گائیڈ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے ایک میلے کو تاریخی عمارت کے سُرخ ستونوں، شیش محلوں، باغوں، دیوانوں اور زیرِ زمین راستوں میں سے گھماتا پھراتا قدیم اسلحہ کے عجائب گھر میں داخل ہو گیا۔

"خواتین و حضرات" اُس نے طمنچوں، سنگینوں، نیزوں، تلواروں، ڈھالوں، زرہ بکتروں وغیرہ کی جانب ان کی توجہ مبذول کروائی "یہ سنگینیں جنھیں ہم نے اب پالش کروا کے نمائش پر رکھا ہے، انھیں اگر نچوڑا جائے تو خون کی ندیاں بہہ نکلیں اور یہ تلواریں ریڑھ کی ہڈیوں میں سے یُوں گذرتی تھیں جیسے مکھن میں اُنگلی۔ ان توپوں کے دہانوں پر باغیوں ...... معاف کیجیے گا وطن پرستوں کو باندھ کر اُڑا دیا جاتا تھا۔ اور یُوں اُس زمانے کے حکمران ایک مستحکم اور مثبت حکومت بنانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ وہ ہتھیار ہیں جن کی دہشت سے عوام فوج کے آگے کُبڑے ہو کر چلتے تھے مگر بربریت کے زمانے لد چکے۔ آج کے تہذیب یافتہ عہد میں تو اُن مظالم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اس شکنجے کو ملاحظہ فرمایئے جو اُنگلیوں کو جُوس مشین میں داخل ہوتی ہوئی گاجروں کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ مگر اب ہمارے ملکی قوانین میں ایسی ایسی دفعات موجود ہیں کہ کوئی کسی کی جانب اُنگلی بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ ہمیں پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم اُس وحشی عہد میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک ترقی یافتہ معاشرے کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ یہ تاریخی عجائب گھر

صرف جبر اور ظلم کی ایک یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے تاکہ ہم آج اپنی خوش بختی پر نازاں ہو سکیں۔ اُن زمانوں میں نہ صرف قاہر حکمران عوام پر ظلم ڈھاتے تھے بلکہ فوج جنگیں لڑنے کے علاوہ معصوم شہریوں کا قتلِ عام بھی کرتی تھی..... ذرا تصور کیجیے کہ......

"کہ اس زمانے میں فوج جنگیں بھی لڑتی تھی؟"

بابا بگوس جب دن چڑھے سو کر اُٹھا تو اس نے حسبِ معمول باورچی خانے کا رُخ کیا اور وہیں بیٹھ کر پتلی تلنگ چائے کے گھونٹوں سے باسی روٹی کے چند نوالے پیٹ میں اُتار لیے۔ پھر وہ حسبِ معمول اپنی کوٹھڑی میں واپس آیا اور حسبِ معمول ایک کونے میں بیٹھ کر حسبِ معمول چھت کو گھورنے لگا۔ کتنے ہزار دنوں سے وُہ اس چھت کو گھور رہا تھا؟ اُسے یاد نہ تھا کسی کو بھی یاد نہ تھا۔ یادداشت کی نبضیں کب چھوٹیں، کسے یاد تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے یہاں تھا۔ جیسے ان اُونچی اُونچی دیواروں اور کوٹھڑیوں کے ہمراہ معماروں نے بابے بگوس کو بھی تعمیر کر دیا ہو۔ جتنا عرصہ صحن میں دھوپ پھیلتی رہتی وہ اپنے کمرے میں جبڑے مُقفّل کیے، منہ اُٹھائے بیٹھا رہتا، کبھی کبھار اپنی سفید داڑھی کھجلا کر مزہ لیتا اور پھر چھت کو گھورنے لگتا۔ جب دھوپ صحن کی دیواروں کو سست روی سے ناپتی اُوپر اُٹھ جاتی تو وہ باہر نکل آتا اور ایک بوسیدہ ٹاٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا اور اب نیلی چھت پر آنکھیں جما دیتا۔ اس کے آس پاس اہلکار لاتعلقی سے گزرتے رہتے۔ اپنے اپنے کاموں میں مصروف، زخمی جسموں کو گھسیٹتے، کوٹھڑیوں میں پھینکتے ہوئے، چھتروں کی مرمت کرتے ہوئے، برف کے بلاک سر پر اُٹھائے جنھیں ننگے بدنوں کی گرمی سے پگھلنا ہوتا تھا وہ لاتعلقی سے گزرتے رہتے جیسے باغ میں بنچ پر اُونگھتے کسی بوڑھے کے قریب سے نوجوان جوڑے لاپروا ہو کر مصروف رہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

ایک شام حسبِ معمول بابا بگوس اپنی کوٹھڑی میں سے اُٹھ کر صحن میں آیا تو وہاں اُس کی بیٹھک والا ٹاٹ موجود نہ تھا اور بکا ماشکی اپنے ننگے پاؤں پر نیم دائرے میں گھومتا ہُوا بڑی مستعدی سے صحن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

"کسی بادشاہ نے آنا ہے ؟" بابے بگوس کے لیے بندی خانے میں باہر سے آنے والے تمام افسر بادشاہ تھے۔

بکے ماشکی نے مشکیزے کے نرم چمڑے کو ایک جنسی پیشہ ور کے میکانکی انداز میں پچکاتے ہوئے "ہُوں" کیا اور پانی چھڑکتا رہا۔

بابا اپنے ٹاٹ کے بغیر ہی کونے میں بیٹھ گیا اور آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

چھڑکاؤ مکمل ہُوا تو ایک صوفہ سیٹ اور چند کرسیاں برآمدے میں سجا دی گئیں، پھر اہلکار لکڑی کی بنی ہوئی ایک دوساکھی اُٹھا کر لائے اور اُسے صحن کے درمیان میں نصب کر دیا۔ دُور سے یوں لگتا جیسے یہ سٹینڈ کسی مصوّر کے لیے وہاں رکھا گیا ہے اور وہ ابھی آئے گا اور اس پر کینوس رکھ کر بندی خانے کی تصویر کشی شروع کر دے گا۔ مگر اس سٹینڈ پر تصویروں کی بجائے زندہ ماڈل رکھے جاتے تھے۔ اسی دوران چند بھاری بُوٹوں والے بندی خانے والے بڑی سرکار کے ہمراہ آئے، اور بڑی سرکار بھی اُن کے سامنے جھک کر چل رہی تھی اور وہ صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ ان کے ہمراہ تازہ استری شدہ سفید کوٹ میں ملبوس ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کے گلے میں ایک سٹیتھو سکوپ جھول رہی تھی، موت کی سزا پانے والے مجرم کو دُعائے مغفرت دینے کے لیے دیر سے آنے والے تیز تیز چلتے کسی پادری کے گلے میں لٹکتی صلیب کی طرح۔ وہ سب آپس میں گفتگو کرتے ہوئے بار بار قہقہے لگا رہے تھے۔ بھاری بُوٹ گلا پھاڑ کر اور بڑی سرکار قدرے محتاط ہو کر۔

"میرا خیال ہے اب شروع کر دیں۔" ایک بھاری بُوٹ نے سرکار سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"سر اگر پہلے ایک کپ چائے کا ہو جائے تو کیا حرج ہے، چار بجنے کو ہیں۔"

جواب کا انتظار کیے بغیر بڑی سرکار کی گرج "چائے" باورچی خانے تک پہنچی اور ایک اہلکار چائے کی ٹرالی گیلے صحن پر گھسیٹتا چلا آ رہا تھا (اگر ادھ موئے مجرموں کے جسموں کو گیلے صحن پر گھسیٹا جائے تو زیادہ زور نہیں لگانا پڑے گا۔ آئندہ روز چھڑکاؤ ہونا چاہیے، اہلکار نے سوچا) چائے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے۔

"کیک عمدہ ہے۔" بھاری بُوٹ اپنی مونچھ پر سے ذرّے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"سر مال روڈ سے منگوایا ہے۔ میرا اپنا بندہ لے کر آیا ہے۔"

"میرا خیال ہے اب......"

بڑی سرکار نے کوٹھڑیوں کی جانب ایک نظرِ مخصوص ڈالی اور جیسے اس نظر کی ہتھکڑی میں بندھا ہُوا ایک قیدی کا جسم وہاں سے برآمد ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو سپاہی چل رہے تھے۔ ڈاکٹر نے فوراً اُٹھ کر قیدی کو آدھے راستے میں ہی جا لیا جیسے اس کا استقبال کرنا چاہتا ہو۔ اُس نے سرسری طور پر سینے کو ٹھونک بجا کر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ "کتنے ؟"

بڑی سرکار نے ایک ڈکار کے درمیان میں "پندرہ" کا لفظ بمشکل ادا کیا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے فوراً سر ہلایا اور پھر جلدی سے واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا جیسے اُسے ڈر ہو کر پیالی میں بقیہ ماندہ چائے کہیں ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

بڑی سرکار نے اب کی مرتبہ کوٹھڑیوں کی جانب ایک اور نظرِ مخصوص ڈالی اور وہاں سے تیل میں چپڑا ایک لشکتا ہُوا کریہہ المنظر آدمی لنگوٹ کو گرہ دیتا ہُوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کوڑا تھا۔

قیدی کے تمام کپڑے اُتار کر اُسے ٹکٹکی سے باندھ دیا گیا۔ لنگوٹیے نے بڑی سرکار کی جانب دیکھا اور اُن کے سر ہلانے پر ٹکٹکی سے منہ موڑ کر دیوار کی طرف ڈگ بھرنے لگا۔ دیوار کے قریب بابا بگوس بیٹھا تھا۔ دیکھ رہا تھا، آسمان کی طرف نہیں بلکہ اس نئے تماشے کو۔

پچھلے پانچ چھ برسوں سے اس بندی خانے میں مجرموں کی آمد معمول کے مطابق

رہی تھی۔ مگر اس کے بعد پچھلے چند ماہ میں اس ٹریفک میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر یکدم گرمیوں کی ایک صبح کو سپاہی عنایت نے بابے کو رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ بڑی سرکار کی بڑی سرکار کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک اور بڑی سرکار نے لے لی ہے۔ چنانچہ اگلے روز میں پچھلے تمام قیدی رہا کر دیئے گئے۔ چند ہفتے بڑے امن و سکون سے گزرے۔ اہل کار سارا دن اونگھتے رہتے اور بندی خانے کی بڑی سرکار کا چھتر دھوپ میں پڑا اکڑتا رہتا۔ مگر پھر یک دم ٹریفک جاری ہو گئی۔ جاری کیا ہو گئی باقاعدہ ٹریفک جام ہو گیا۔ ایک ایک کوٹھڑی میں درجنوں قیدیوں کو ٹھونسا جاتا اور بڑی سرکار نے متعدد نئے چھتروں کا آرڈر دے دیا۔ بقول سپاہی عنایت کے اتنی رونقیں اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

لنگوٹیے نے بابے بگوس کے قریب پہنچ کر کوڑے کو ایک جھٹکا دے کر چٹاخہ سا چلایا، پھر ٹکٹکی پر بندھے جسم کی ننگی پیٹھ پر نظریں جما کر "یا علی" کا نعرہ بلند کیا اور ایک بھیانک قسم کے رقص کے انہیں تُلے قدم اُٹھاتا، اپنے جسم کو لہراتا ہوا بھاگا۔ ننگی پیٹھ کے قریب جا کر کوڑا ہوا میں لہرایا مگر یک دم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے معذرت طلب آنکھوں سے بڑی سرکار کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا واپس بابے بگوس کے قریب آ کر کھڑا ہوا۔ "یا علی" کا نعرہ لگایا اور انہی مخصوص قدموں سے زِگ زیگ کے انداز میں بھاگا مگر اس مرتبہ بھی وہ ننگی پیٹھ کی قربت میں پہنچ کر کوڑا ہوا میں لہرانے کے بعد یکدم کھڑا ہو گیا۔

بڑی سرکار نے بے حد شرمندہ ہو کر بھاری بوٹوں کی جانب دیکھا اور پھر گرج کر کہا "اوئے ماں کے کھسم! کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"سرکار پریکٹس نہیں رہی۔" لنگوٹیا لرزتے ہوئے بولا "مولا کے کرم سے اب غلطی نہیں ہو گی مائی باپ۔"

وہ بڑا پشیمان چہرہ لیے بابے بگوس کے پاس واپس آیا۔ دوڑنے سے پہلے اس کے چہرے کا رنگ مزید کالا ہو گیا اور اس نے یک دم مڑ کر بابے بگوس کی کمر

میں ایک ٹھڈا رسید کیا۔ "میں بھی کہوں کہ کوڑا اُٹھانے سے پہلے آخری قدم ٹھیک کیوں نہیں پڑتا، یہ ماں کا یار جو یہاں بیٹھا ہوا ہے...... سرکار میری دوڑ پورے بیس قدموں کی ہوتی ہے اور یہ خبیث اسی بیسویں قدم پر بیٹھا ہوا ہے۔ اُٹھ اوئے......"

بابا چپکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لنگوٹیے نے ایک نشہ آور اطمینان سے ایک ایسے باؤلر کی طرح قیدی کی طرف دیکھا جسے معلوم ہے کہ اس کا بیس قدموں کا باؤلنگ سٹارٹ اب درست ہے اور وہ یقیناً وکٹ اُکھاڑ دے گا، ننگی پیٹھ کا ماس اُدھیڑ دے گا۔

بابا بگوس اپنی کوٹھڑی میں آ گیا اور باہر بڑی سرکار اور بھاری بوٹ چائے پیتے رہے، کیک کھاتے رہے اور پیٹھ کا ماس اُدھڑتے اُدھڑتے باریک قیمے میں بدلتا رہا۔

بابا بگوس اس سے پیشتر اذیت کی بے شمار تحریریں ننگے جسموں میں کھدی ہوئی دیکھ چکا تھا لیکن یہ تماشہ نیا تھا۔ مگر چند ہی دنوں میں یہ تماشہ بہت ہی پرانا ہو گیا۔ روزانہ درجنوں افراد کو کوڑے لگتے۔ ڈاکٹر اب باقاعدہ معائنہ کرنے کی بجائے قیدی پر ایک نظر ڈال کر "بندہ کے لیے صحت مند ہے" کا سرٹیفکیٹ دے دیتا اور ناظرین کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ بابے کو اس نئے تماشے پر صرف ایک ہی اعتراض تھا، وہ شام ڈھلے اپنی کوٹھڑی سے نکل کر صحن میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کیونکہ لنگوٹیے کا سٹارٹ بیس قدم کا تھا اور وہی بیسواں قدم بابے کی نشست گاہ تھی۔

بابا بگوس ہمیشہ سے یہاں تھا، وہ یہاں قیدی تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ شادی کا ایک ایسا ہار تھا جسے پہننے والا دولہا اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ یہ ہار تو خانے کے کسی کونے کھدرے میں پڑا ہے اُسے پھینکا بھی نہیں جا سکتا کہ

اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا۔ ٹھیک ہے پڑا رہے ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر وہ شادی کب ہوئی تھی کسی کو یاد نہ تھا۔

بابا بگلوس اس بندی خانے میں کیوں آیا، کب آیا؟ اور اب یہاں کیوں ہے؟ ان سوالوں کا جواب بڑی سرکار یا اہلکاروں کے پاس نہ تھا اور اس کی وجہ نہایت سادہ تھی کہ جس زمانے میں ان سب سوالوں کے جواب موجود تھے اس زمانے میں اس بندی خانے میں موجود بڑی سرکار اور اہلکار وہ لوگ تھے جواب تک یا تو فوت ہو چکے تھے، یا ریٹائر ہو چکے تھے، یا پھر ملک کے دوسرے بندی خانوں میں اہم خدمات انجام دے رہے تھے۔ جو بھی نئی سرکار یہاں آتی تو پہلے روز معائنے پر نکلتے ہی سب سے پہلا سوال جو اہلکاروں سے پوچھا جاتا یہی ہوتا کہ یہ بابا یہاں کیوں آیا؟ جواب "معلوم نہیں سرکار" میں ہوتا۔

"کب آیا؟"

"جی جب ہم آئے تو یہ یہیں پر موجود تھا۔"

"اب تک یہاں کیوں ہے؟" اس کا جواب بھی کچھ اس قسم کا ہوتا کہ سر اس کی رہائی کا حکم کبھی نہیں آیا۔

اور "کیوں نہیں آیا؟" اس کا جواب بہت آسان تھا۔ بڑی سرکار کے دفتر سے ملحقہ ایک ریکارڈ روم تھا جہاں اس بندی خانے میں آنے والے تمام "جرائم پیشہ" افراد کا باقاعدہ ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اصولاً بابے بگلوس کے جرائم کی فائل بھی یہیں ہونی چاہیئے تھی مگر تھی نہیں۔ ہر نئی بڑی سرکار نے بابے کے رعشہ زدہ جسم کو دیکھ کر حکم دیا کہ بابے کی فائل ڈھونڈ کر لاؤ کہ آخر یہ بزرگوار کس گناہ کی پاداش میں یہاں بند ہے۔ مگر وہ فائل کبھی دستیاب نہ ہوئی اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی۔ اب چونکہ ہر مہذب ملک میں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے اور قانون کے مطابق کسی شخص کو تب تک رہا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کی فائل پر رہائی کے احکامات صادر نہ کیے جائیں اس لیے بابے بگلوس کو قانونی طور پر

(اور اگر ہم قانون کی پاسداری نہ کریں تو ہم میں اور درندوں میں کیا فرق رہ جائے) رہا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ سے یہاں تھا۔ اس کی نقل و حرکت پر یعنی بندی خانے کی حدود میں کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ جہاں جی چاہے آ جا سکتا تھا، ہر کسی سے گفتگو کر سکتا تھا۔ تمام اہل بندی خانہ اس کے ساتھ ایک اہل خانہ کا سا سلوک کرتے تھے۔

مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کبھی بھی اس بندی خانہ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کبھی سال چھ ماہ بعد بابا بگلوس (دراصل یہ اس کا اصلی نام تو نہ تھا جو فائل گم ہو جانے کی وجہ سے بابے کے علاوہ اور کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ پہلے پہل اسے صرف بابا کہا جاتا تھا۔ پھر ایک روز کسی اہلکار نے اس کے سفید سر اور چھوٹی سفید داڑھی کو کونے میں دبکا دیکھ کر کہا۔

"بابا تو دُور سے بگلا دکھائی دیتا ہے۔"

چنانچہ اُسے بابا بگلا کہا جانے لگا جو بگڑتے بگڑتے بابا بگلوس ہو گیا) ہاں تو کبھی سال چھ ماہ بعد بابا بگلوس چپ ہو جاتا، بالکل خاموش ہو جاتا، کھانے کے لیے جو روٹی ملتی اُسے صحن میں بیٹھ کر چڑیوں اور کوّوں کو کھلا دیتا اور خود بالکل بھوکا رہتا۔ رات کے وقت اپنی کوٹھڑی میں مسلسل ٹہلتا رہتا۔ صبح سویرے اہلکار دیکھتے کہ اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے نچڑ رہی ہے اور وہ جان جاتے کہ یہی وہ دن ہے جب بابا بگلوس چپکے سے ان کے پاس آئے گا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی ان کے گالوں سے چھوئے گی اور وہ شرمندہ سا ہو کر کہے گا "مجھے باہر لے چلو۔"

چنانچہ صرف کارروائی پوری کرنے کی غرض سے دو سپاہی اس کے ساتھ متعین کر دیئے جاتے اور وہ بابے کو اس تاریخی عمارت سے باہر شہر میں لے جاتے۔ بابا بھرے پُرے شہر کے شور میں بند گھڑیال کی طرح خاموش، سر جھکائے ماتمی حالت میں گھومتا رہتا اور کبھی نظر اُٹھا کر نہ دیکھتا کہ اس کے آس پاس، چار چفیرے کیا ہو رہا ہے۔ پورے ایک گھنٹے کے بعد بابا اسی طرح چپکے سے سپاہی کے کان میں سرگوشی کرتا "مجھے واپس لے چلو" اور وہ اُسے واپس لے جاتے۔

حفاظتی عملے کے ارکان، دیگر اہلکار اور بندی خانے کی بڑی سرکار کی بھی شدید خواہش تھی کہ بابے لنگوس کو کسی طرح رہا کر دیا جائے مگر گم شدہ فائل ہمیشہ آڑے آ جاتی۔ کل کلاں وہ فائل کہیں سے نمودار ہو جاتی اور حکومتِ وقت پوچھ لے کہ فلاں بابا کہاں گیا، تو پھر کیا ہو گا؟ چنانچہ ایک خاموش سازش کے تحت یہ طے پا چکا تھا کہ بابے کی حفاظت بالکل نہ کی جائے اور اسے فرار ہونے کے تمام تر مواقع میسر کیے جائیں مگر بابے نے انھیں ہمیشہ مایوس کیا اور اس مسئلے پر بالکل توجہ نہ دی۔ کچھ برس پہلے بابے لنگوس کی سالانہ یا ششماہی "مجھے باہر لے چلو" والی شہر کی سیر کے دوران سپاہی عنایت نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا "بابا! آخر تم بھاگ کیوں نہیں جاتے؟"

بابے نے جھکا ہوا سر جھکا ہی رہنے دیا اور چلتا رہا۔

دوسرے سپاہی صابر نے عنایت کی ہاں میں ہاں ملائی "دیکھو اگر تم بھاگ جاؤ تو ہم واپس جا کر کہہ دیں گے کہ جی بابا فرار ہو گیا ہے اور تمھارا کیس خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

بابے نے سر جھکائے رکھا۔

"یہ نہیں کہ تم ہم پر بوجھ ہو۔ ہم تو تمھیں ایک بزرگ کی طرح چاہتے ہیں مگر بابا یہ تمھاری عمر ہے بندی خانے میں پڑا سڑنے کی...... بھاگ جاؤ۔"

بابے نے سر اُٹھایا اور مسکرانے لگا۔

"بھاگ جاؤں؟"

"ہاں ہاں" دونوں نے اس کی ہمت بڑھائی۔

"اچھا" بابا منہ کھول کر بولا "لیکن بھاگتے کیسے ہیں؟"

یہ سوال سن کر دونوں سپاہی سوچ میں پڑ گئے اور پھر یکدم عنایت نے چمک کر کہا "وہ ایک سیاسی قیدی نہیں تھا جسے ہم نے الف ننگا کر کے صحن میں دوڑنے لگوائی تھی۔ بس جیسے وہ بھاگتا تھا ناں ہمارے چھتروں سے بچنے کے لیے ویسے......"

بابے نے اپنے ذہن میں اُس ننگے دہشت زدہ کانپتے بدن کی تصویر زندہ

کی اور پھر سر کھجلا کر بولا "میں بوڑھا ہوں۔ مجھ میں تو سکت نہیں اُس طرح بھاگنے کی۔"

"بابا یہ ضروری نہیں کہ تم اُسی طرح بھاگو...... ہم اِدھر کی بجائے اُدھر منہ موڑ لیتے ہیں اور تم بے شک آہستہ آہستہ چلتے اطمینان سے سامنے والی گلی میں غائب ہو جاؤ۔ ہم تمھارا پیچھا نہیں کریں گے، یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔"

بابے نے داڑھی مٹھی میں دبا کر جھٹکا سا دیا جیسے فیصلہ کر لیا ہو، دو تین قدم چلا مگر پھر کھڑا ہو گیا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" صابر نے پوچھا۔

"میں اگر بھاگ ہی جاؤں تو پھر کیا ہو گا...... یعنی مجھے کیا ہو گا؟"

"تم آزاد ہو جاؤ گے بابا۔ آزاد......!"

"اچھا" بابے نے پھر منہ کھول دیا "آزاد ہو کر انسان کیا ہو جاتا ہے؟"

سپاہی صابر نے عنایت کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا کہ بھئی اس سوال کا جواب تو تم دے دو۔ اس پر عنایت منہ پر ہاتھ رکھے بغیر زور سے کھانسا اور بابے کے قریب چلا گیا۔ "ہونا کیا ہے...... بس آزاد ہو جاتا ہے۔"

صابر کو عنایت سے اتنی کند ذہنی کی اُمید نہ تھی۔ چنانچہ اُسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف کیا اور بابے سے کہنے لگا "آزادی کا بڑا سواد ہے بابا۔ بندہ مرغ چھولے کھا سکتا ہے، کون آئس کریماں کھا سکتا ہے، منڈوا دیکھ سکتا ہے اور پھر آزاد انسان...... جہاں جی چاہے جائے......"

"اور اگر نہ جانا چاہے تو؟" بابے نے پوچھا۔

"تو نہ جائے۔"

"ایسا تو میں بندی خانے میں بھی کر سکتا ہوں۔" بابا مسکرانے لگا۔

"اور صرف یہی نہیں بابا لنگوس اس کے علاوہ بھی آزادی کے بڑے مزے ہیں...... جسے چاہے ملے۔ تمھارے رشتے دار بھی تو ہوں گے؟"

بابے نے پھر سر جھکا لیا۔

"بہر حال بابا تم خدا کے لیے بھاگ جاؤ۔" اِن دونوں نے لاچار ہو کر منت کی۔

بابے نے کندھے سکیڑے اور پھر اُسی رفتار سے آہستہ آہستہ چلنے لگا عنایت اور صابر نہایت سنجیدہ چہرے بنا کر دوسری جانب دیکھنے لگے۔ تقریباً دس منٹ کے وقفے کے بعد جب اُنھوں نے مُڑ کر دیکھا تو بابا بگوس وہاں موجود نہ تھا۔ دونوں نے اطمینان کا ایک بہت ہی گہرا سانس لیا اور ہنسنے لگے۔ پھر عنایت بولا۔ "ویسے یار صابر! بابے کے بغیر بندی خانہ لگے گا سُونا سُونا...... اب چلیں واپس؟ جا کر رپورٹ لکھوا دیں گے کہ بابا بگوس بالآخر فرار ہو گیا ہے۔ ویسے بڑی سرکار اس خبر سے خوش ہی ہو گی۔"

"نہیں ابھی واپس نہیں جاتے گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک دو گھنٹے کے بعد جائیں گے تاکہ رپورٹ میں کارروائی کے طور پر درج ہو جائے کہ ہم اُسے تلاش بھی کرتے رہے ہیں۔"

اُس شام جب عنایت اور صابر اس تاریخی عمارت کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے تو اُنھیں اپنے پیچھے ہف ہف کی سی آواز آئی جیسے ایک تھکے ہوئے بوڑھے بُل ڈاگ کے کھلے ہوئے منہ سے برآمد ہوتی ہے۔ بابا بگوس سر جھکائے لڑکھڑاتی ٹانگوں کو بمشکل سنبھالتا ان کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

فرار کے اس عظیم منصوبے کی ناکامی کے بعد بڑی سرکار اور اہلکاروں نے بابے بگوس کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ روٹین کے تابع اپنی کوٹھڑی میں چھت کو اور شام کو صحن کے کونے میں بیٹھ کر آسمان کو گھورنے میں دن گزارنے لگا تا آنکہ اس سے صحن کا وہ کونہ چھن نہ گیا۔ کیونکہ وہاں بیسواں قدم تھا اور اُنیس قدموں کے آغاز سے کوڑا شرلاٹے بھرتا ہوا اس طور نہیں لہرایا جا سکتا تھا کہ ننگی پیٹھ کا گوشت باریک ذروں والے لوتھڑوں میں بدل جائے۔

اپنی پسندیدہ نشست سے محروم ہونے کے چند ہفتوں بعد بابا بگوس ایک مرتبہ پھر چُپ ہو گیا۔ کھانے کے لیے جو روٹی ملی وہ چڑیوں اور کوّوں کو کھلا دی۔ رات کے وقت کوٹھڑی میں ٹہلتا رہا اور صبح سویرے عنایت کے گال سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی داڑھی چھُوئی۔ "مجھے باہر لے چلو۔"

اس روز شہر میں شور تھا۔

شور تو پہلے بھی ہوتا تھا مگر آج زیادہ تھا اور زیادہ شور تبھی ہوتا ہے جب لوگ بھی زیادہ ہوں۔ وُہ سب شہر کی ایک بڑی سڑک پر واقع جیل خانے کی جانب رواں تھے۔ بابا بگوس حسبِ عادت سر نیہوڑائے چلتا رہا۔ کئی لوگ اس کے بوڑھے جسم کو دھکیلتے ہوئے آگے نکل رہے تھے، انھیں بے قراری نے ڈسا ہوا تھا دو بجے کا وقت نشر ہوا تھا اور صرف تین گھنٹے باقی تھے۔ عنایت اور صابر بھی بابے کے ہمراہ میکانکی کھلونوں کی طرح چلتے رہے۔ وہ اس کی سالانہ یا شہنشاہی سیر کے لُطف میں کم سے کم حائل ہونا چاہتے تھے۔ ہجوم زیادہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر بابے کو رُکنا پڑا کہ اس کے آگے جسموں کی دیواریں تھیں۔ اُس نے پہلی مرتبہ سر اُٹھا کر عنایت سے پُوچھا۔

"آج عید ہے؟"

"نہیں بابا۔" عنایت مسکرایا۔ "عید ہوتی تو صبح حلوہ نہ ملتا بندی خانے میں۔"

وُہ تینوں ہجوم کی دراڑوں میں سے پھنس پھنس کر نکلتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔

آئس کریم والوں کو صدا دینے کی حاجت نہ تھی کہ ان کے ہاتھ ریڑھیوں کے سرد خانوں میں ڈوبتے نکلتے تھک رہے تھے۔ مشروبات کی بوتلوں کے کریٹ ڈلیوری ٹرک سے اُترنے اُترتے فروخت ہو جاتے۔ پان سگریٹوں کے عارضی کھوکھے فٹ پاتھ پر سجتے سجتے خالی ہو رہے تھے۔ حلیم کی دیگیں ہجوم بھوکے باراتیوں کی طرح چٹ کر رہا تھا۔ کئی خاندان ہجوم سے ہٹ کر درختوں تلے پکنک منا رہے تھے کہ وہ عقلمند

تھے اور دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ آس پاس کی تمام دکانیں بند تھیں کہ دکاندار بھی آج موج میلے کے موڈ میں تھے۔ بھلا روز روز ایسا تماشہ دیکھنے کو کہاں ملتا ہے سڑک پر میکانکی ٹریفک کی ممانعت کر دی گئی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو سکیں۔ میدان تو خیر پہلے سے ہی انسانوں کے سروں سے بھرا ہوا تھا، لیکن اردگرد کی عمارتوں پر نظر ڈالنے سے شک ہوتا تھا کہ وہ اینٹوں کی بجائے جسموں سے بنی ہوئی ہیں۔ لاکھوں کا مجمع تھا کہ بقیہ شہر اس وقت ویران پڑا تھا۔ شیر خوار بچوں کی حوصلہ مند مائیں انھیں چادروں میں چھپا کر دودھ پلا رہی تھیں مگر دوڑیوں پر کھڑے ہونے سے اور ہجوم کے سروں کے اوپر دیکھنے کی جستجو میں یہ کام قدرے دشواری سے سرانجام پا رہا تھا۔ قریب ہی ایک مسمار شدہ عمارت کا ملبہ تھا اور اس کا ٹھیکیدار دو روپے فی کس کے حساب سے لوگوں کو ملبے کے ڈھیر پر کھڑا ہونے کے اجازت نامے دے رہا تھا۔ ڈھیر سطحِ زمین سے ظاہر ہے بلند ہوتا ہے اور اس پر کھڑے ہو کر منظر صاف نظر آتا ہے وہاں سے پچھلے دو دنوں میں تعمیر شدہ چبوترے اور ان پر نصب شدہ لکڑی کے چوکھٹے صاف نظر آ رہے تھے اور چوکھٹوں سے پھندے لٹک رہے تھے۔

جیسا کہ مہذب ملکوں میں دستور ہوتا ہے پابندیٔ وقت کو ملحوظ رکھا گیا اور پورے دو بجے جیل کے اندر سے ایک جیپ نمودار ہوئی۔ قاتلوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں تھیں۔ انھیں چبوتروں پر کھڑا کر دیا گیا۔ مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ وہ اپنے اپنے پھندوں کے سامنے کھڑے ہوں جو شاید گردن کی موٹائی کے حساب سے بنائے گئے تھے۔ مجمع مکمل طور پر خاموش ہو گیا۔ یا یا لگوں تو پہلے ہی خاموش تھا۔ پہلے قاتلوں کے چہروں پر نقاب ڈالے گئے۔ ان کے کندھے پکڑ کر انھیں پھندوں کے عین نیچے لے جایا گیا اور پھر انتہائی احترام سے یہ پھندے باری باری ان کی گردنوں کے گرد کس دیئے گئے۔ ہجوم پر سناٹے کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ یکدم وہ قاتل جو چند روز قبل انسان کہلاتے تھے ان

کے پاؤں تلے سے لکڑی کے تختوں کی زمین کھسک گئی اور وہ ہوا میں جھولنے لگے۔ سناٹے کی چادر اس لمحے تار تار ہوئی اور ہجوم کے ایک حصے نے پاکیزہ جذبات سے منور ہو کر نعرۂ تہذیب بلند کیا اور لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر زندہ باد کے نعرے لگا کر ثواب میں شریک ہونے لگے۔ وہ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے بیشتر کی آنکھوں میں آنسو تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں یہ پاکیزہ منظر دیکھ لیا۔ قاتلوں کے جسم پھڑکتے تھے اور پھر ڈھیلے پڑ جاتے تھے جیسے بکرے کا تازہ ذبح شدہ گوشت پھڑکتا ہے اور ساکت ہو جاتا ہے۔ جیسے کنڈی میں پھنسی مچھلی کی دُم بار بار پھڑکتی ہے۔ ان کا سانس منقطع ہونے پر، گردن کے منکے ٹوٹنے سے اذیت کی جو لہریں فضا میں پھیل رہی تھیں وہ ہجوم کے لیے حیاتِ جاودانی کی ہوائیں تھیں، وہ انھیں سونگھ رہے تھے، اپنے بدن کے پوروں میں جذب کر رہے تھے اور مزید پُر جوش ہو رہے تھے۔ وہ انصاف کا تماشا دیکھنے آئے تھے، ایک نئے نظام کے آغاز کے چشم دید گواہ بننے آئے تھے کہ اس عبرت انگیز منظر کے بعد مُلک میں قاتلوں، ڈاکوؤں، بردہ فروشوں کی نسل ختم ہو جانی تھی۔ یہ وہ نمک تھا جو ان کیچوؤں پر ڈال دینے سے وہ ہمیشہ کے لیے تحلیل ہو جائیں گے۔ آج کے بعد جرم ایک ایسا لفظ ہو گا جو صرف کتابوں میں ملے گا (اور پھر کون نہیں جانتا کہ ایسا ہی ہوا) لوگ اسی لیے تو آئے تھے، آخری قاتل کو دیکھنے کے لیے۔ وہ عبرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ قہقہوں کے درمیان نعرے بھی لگا رہے تھے اور قاتلوں کے، ملک کی تاریخ میں آخری قاتلوں کے جسم پھڑک رہے تھے۔ جوں جوں نیم مُردہ گوشت کے لوتھڑے ٹھنڈے ہونے گئے، ہجوم کی مایوسی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ جسم سدا یونہی پھڑپھڑاتے رہیں۔ وہ کل ناشتہ کر کے یہاں آئیں تو یہ جسم اسی طرح پھڑک رہے ہوں۔ پھر وہ اپنے دفتر یا کاروبار سے فارغ ہو کر شام کو ادھر سے گزریں تب بھی یہ بدن کسی اناڑی رقاصہ کی طرح ہل رہے ہوں۔ چھٹی کے روز بچوں کے ساتھ یہ سامنے والے باغ میں سیر کے لیے آئیں تو یہ لٹکتے ہوئے بکرے پھر بھی حرکت میں ہوں۔

آخر اُن کے چہروں پر نقاب کیوں ڈالے گئے تھے۔ نقاب نہ ہوتے تو وہ اُن کی زبانوں کو باہر لٹکتا دیکھ سکتے، پیاسے کُتوں کی لمبی لٹکتی زبانوں کی طرح۔ ان کی آنکھیں اُبل کر باہر آ جاتیں۔ شاید ایک آدھ کی آنکھ کا ڈھیلا ٹوٹ کر گِر جاتا اور وہ اُسے بچوں کے کھیلنے کے لیے اُٹھا لے جاتے۔ وہ آخری دموں پر اُن کے ہونٹوں کی نیلی لرزش کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کے گلوں میں سے نکلنے والی خرخراہٹ بھی سُننا چاہتے تھے اور یہ ممکن ہو سکتا تھا اگر اُن کے قریب طاقتور مائیک فِٹ کر دیئے جاتے (بلکہ اُن کے گلوں کے ساتھ باندھ دیئے جاتے) اور پورے علاقے میں لاؤڈ سپیکر لگا دیئے جاتے۔ انتظامیہ کو اس قسم کی کوتاہی آئندہ نہیں کرنی چاہیئے، مگر آئندہ کا کیا مطلب، آئندہ تو کوئی قاتل ہو گا ہی نہیں۔

قاتل پھندوں سے جھُوم رہے تھے اور تماشائی خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ اِن لٹکتے جسموں کے پاؤں دلوچ کر اُنھیں اور زور سے جھُلاتے، خود جھُولا جھُولتے، اُن کے ٹھنڈے پڑتے جسموں کی پینگوں کے ساتھ جھُولنا جھُلا ڈالتے۔ اور اب تو اِن جسموں نے تڑپنا چھوڑ دیا تھا۔ کتنے احمق لگ رہے تھے وہ، جیسے پارسل لٹک رہے ہوں۔ جیل کے ڈاکٹر نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پارسلوں کو ٹٹول کر اُنھیں مُردہ قرار دے دیا۔ اُن کے جسم پھندوں سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ تماشے کا کینوس عبرت کی تصویر سے خالی ہو گیا۔ ہجوم بُڑبڑاتا ہُوا بکھرنے لگا۔

"یار جگہ بہت کم تھی۔ ٹھیک طرح سے دکھائی ہی نہیں دیا۔ سٹیڈیم میں انتظام کر لیتے۔ بیشک ٹکٹ لگا دیتے اور اس آمدنی سے کوئی فلاحی ادارہ قائم کر دیا جاتا، ایک فلاحی مملکت قائم کرنے کا آسان ترین نسخہ۔"

بیشتر لوگ موت کی تیز رفتاری کو کوس رہے تھے۔

"تین چار منٹ کی پھڑپھڑاہٹ اور بس۔ اگر کرکٹ میچ ٹیلیویژن پر دکھایا جا سکتا ہے تو اِن قاتلوں کی موت کو ٹیلی کاسٹ کیوں نہیں کیا گیا۔"

"ہاں اس طرح کروڑوں لوگ عبرت حاصل کرتے۔ کم از کم نظارہ تو قریب سے

ہوتا۔ ہم اُن کے چہروں کو بِگ بِگ کلوز میں دیکھتے۔ بلکہ ان تین چار منٹوں کو بھی اسی طرح ٹی وی پر دکھایا جانا چاہیئے تھا جیسے کسی بیٹس مین کی وکٹ اُڑنے پر اسی منظر کو دوبارہ سلو موشن میں دکھاتے ہیں۔"

"کم از کم چھ سات کیمرے ہوتے۔ ایک کیمرہ اُن کی آنکھوں کا کلوز لیتا۔ دوسرا نتھنوں پر ہوتا، تیسرا ہونٹوں پر۔ چوتھا پورے جسم کا شاٹ لیتا اور سب سے اہم پانچواں جو صرف گردنوں کا بِگ بِگ کلوز لیتا اور یوں سلو موشن میں آنکھیں کیا دھیرے دھیرے کھُلتی چلی جاتیں اور شاید وہ ڈھیلا بھی باہر آ جاتا تو اس منظر کو فوراً دوبارہ دِکھایا جاتا بہت ہی سلو موشن میں۔ نتھنوں پر جو کیمرہ ہوتا اُس کی تصویر بھی خوب ہوتی۔ آہستہ آہستہ پھیلتے اور سُکڑتے نتھنے۔ کہتے ہیں کہ موت سے پیشتر ناک سے خون بھی جاری ہو جاتا ہے۔ کم از کم یہ بھی حتمی طور پر معلوم ہو جاتا اور ہونٹ سلو موشن میں کِس طرح دھیرے دھیرے پھڑپھڑاتے جیسے پھُول کھِل رہا ہو۔ آخری لمحوں میں وہ نیلے پڑ جاتے۔"

"ہاں مگر یار ٹیلیویژن پر کیسے پتہ چلتا کہ ہونٹ نیلے پڑ رہے ہیں؟"

"اس کا حل تو خیر موجود ہے کہ اللہ کے فضل سے ہمارے ملک میں رنگین نشریات بھی تو ہوتی ہیں۔ بس رنگین کیمروں کو نصب کیا جاتا۔ یہ تمام پُرلطف مناظر تو اپنی جگہ مگر اصل کلائمکس تو گردنوں والے سین پر ہوتا۔ ربڑ کی طرح آہستہ آہستہ لمبی ہوتی ہوئی گردنوں کا۔ ٹیلی ویژن پر آنے سے پہلے میک اپ بھی تو ضروری ہوتا ہے، تو وہ پھانسی کے چبوترے پر اُنھیں کھڑا کر کے کیا جا سکتا تھا۔ سُنا ہے کہ میک اپ سے تصویر زیادہ صاف آتی ہے۔ خیر آئندہ سہی، مگر آئندہ تو......"

ہجوم بکھرتا گیا۔ پان سگریٹوں کے کھوکھے اُٹھائے جانے لگے۔ آئس کریم کی ریڑھیاں شہر کی جانب سرکنے لگیں۔ حلیم والے اپنی بھری چلیوں پر ہاتھ رکھے خالی دیگیں ریڑھوں پر لدوا رہے تھے۔ سامنے والی سڑک پھر سے ٹریفک کے لیے کھول دی گئی۔ زندگی نارمل ہو گئی——

بابا بگلوس حسبِ عادت سارا وقت سر جھکائے کھڑا رہا۔ عنایت اور رضا بڑ پچھلے تین گھنٹوں سے ایک ہی مقام پر کھڑے کھڑے تھک چکے تھے۔ اُنھوں نے بابے کی جانب دیکھا جو گُم سُم کندھے ڈھیلے چھوڑے کھڑا تھا۔

"بابا اب واپس چلیں؟" عنایت نے آرام سے پُوچھا۔

بابے نے جیسے سُنا ہی نہیں اُسی طرح چُپ کھڑا رہا۔

قدرے توقف کے بعد عنایت نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "بابا بگلوس، اب واپس چلیں؟"

بابے کے جھکے ہُوئے چہرے سے لٹکتی داڑھی آنسوؤں سے نچڑ رہی تھی۔ اس نے سر اُٹھایا نہیں بس ہَولے سے کہا۔

"نہیں، اب باہر اور اندر کا موسم ایک ہو چکا ہے۔"

غلام دینُ

حسبِ معمول اس صبح بھی،

پانچ بجے کے قریب،

کمرے کے قدموں میں بچھی سنسان اور تاریک سڑک کی خاموشی میں،

کمیٹی کے ٹرک کی گھر رگھر رنے،

ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے نرخرے میں سے نکلتی،

نہ ہونے کی آوازوں کی طرح،

اُس کے بدن کو خبر کی،

موت کا عارضی تجربہ ختم ہُوا۔

گندگی کے انباروں کو ٹرک میں منتقل کرتے وقت مزدوروں میں سانس لیتے ہوئے عورتوں اور مردوں کے درمیانی حصّوں کا ذکر کر رہے تھے۔ اُن کی آوازیں رُکے ہوئے ٹرک کے چلتے ہوئے انجن کی گھر رگھر ر میں مدغم ہو کر اُس کے کانوں پر دستک دینے

لگیں۔ موت کا عارضی تجربہ ختم ہُوا۔ پھر صبح کی خنک ہوا، بیلچوں سے اُتھل پتھل کی جانے والی غلاظت کی بُو اُس کے نتھنوں کے اندر لے آئی۔ اس نے بچاؤ کی خاطر منہ کے راستے ایک طویل سانس لیا...... پھر ایک اور...... پھر ایک اور...... مگر کب تک؟ جب ہر سُو بدبُو کا راج ہو جائے تو انسان کب تک صرف منہ کے راستے سانس لے کر اُس سے فرار حاصل کر سکتا ہے؟ بالآخر اس نے اپنی ناک سے اِس ہلکی بدبودار ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں کھینچا اور پورے ماحول کا ایک حصہ بن گیا...... کم از کم ایک اور دن کے لیے۔ اس نے بستر پر پڑے پڑے اپنے دونوں پاؤں بلند کر دیئے۔ پلی رضائی تھیٹر کے کسی سکڑے ہوئے پردے کی طرح انگلیوں پر سے لٹکی جسے اُس نے ایک جھٹکے سے اپنی ٹانگوں کے نیچے سمیٹ لیا۔ اِسی طور اُس نے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر کے رضائی کو اپنے سر کے نیچے دبا لیا اور پھر روئی کے اس حصار میں مکمل طور پر محفوظ ہو کر آنکھیں جھپکانے لگا۔ شاید میں ایک جائنٹ ہوں جسے للّی پُٹیئنز نے جکڑ رکھا ہے۔

ہاہا۔ مگر میرے دائیں پاؤں کا انگوٹھا بقیہ جسم کی نسبت سرد کیوں ہے؟ انگوٹھے پر نیم خنک ہوا دھیرے دھیرے سرسراتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے محفوظ ہوتے ہوئے انگوٹھے کو ہلکا سا خم دیا...... ہا۔ رضائی کے سوراخ میں پھنس گیا ہے، بلکہ اس وقت یقیناً باہر جھانک رہا ہے۔ عجیب سا لگ رہا ہوگا رضائی کی سطح پر اُگا ہُوا ایک انگوٹھا جیسے پھولدار غلاف کے بیچوں بیچ ایک کھُمب اُگ آیا ہو۔ مگر کھُمب تو شاید سفید ہوتے ہیں اور اس کی رنگت...... بہر حال ایک کالا کھُمب سہی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس منظر کو دیکھے مگر اس کے لیے اُسے روئی کے حصار سے باہر جھانکنا پڑتا اور یوں رضائی کے اندر سٹور کی ہوئی حدّت فرار ہو جاتی۔ چنانچہ وہ چُپکا پڑا رہا...... مگر باہر صبح ہو چکی تھی۔

"حسبِ معمول اُس صبح بھی ایک ہتھوڑے سے شفاف کوارٹر کے قریب لٹکتی ہوئی سلاخ کو قیدیوں کو جگانے کے لیے پیٹا گیا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے جن پر کُہرے کی ایک دبیز تہ جمی ہوئی تھی گھنٹے بجنے

یہ آواز سرایت کرنے لگی اور پھر یکلخت بند ہو گئی۔ باہر غضب کی سردی تھی اور کیمپ کا محافظ زیادہ دیر تک الارم بجانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ جب آئیون ڈینیسووچ بیدار ہُوا تو باہر ہر شے تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی مگر صبح ہمیشہ کی طرح اُس کے سر پر کھڑی تھی۔"[1]

اگرچہ باہر صبح ہو چکی تھی مگر وہ چُپکا پڑا رہا...... اُسے معلوم تھا کہ اُسے اُٹھا دیا جائے گا یعنی کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہونے کو تھا۔

دس!...... ہاں شاید وہ نہا رہی ہوگی...... پتہ نہیں اس میں کیا مصلحت ہے کہ یہ عورتیں بعد میں نہاتی ضرور ہیں...... آخر کیوں؟ کیا اُسے آج ضرورت تھی؟...... پچھلی شب...... ہو سکتا ہے کچھ ہُوا ہو...... ذہن پر کوئی نقش باقی نہ تھا...... جسم پر بھی نہیں؟

نہیں!

نَو!...... گھڑوں میں تازہ پانی

آٹھ!...... پچھلی رات کے گندے برتنوں کی صفائی ہو رہی ہوگی۔

سات!...... آٹا گوندھنا...... اب اس عمل میں بھی شاید جنسی تلذذ کا ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ تازہ آٹا جس پر پانی کے گرنے سے وہی مہک اُٹھتی ہے جو ایک گرم ہوتے ہوئے بدن میں سے پھوٹتی ہے اور کیوں نہیں۔ دھرتی پر جنم لینے والی اور اس میں سے پھوٹنے والی اشیاء کا منبع تو ایک ہی تھا نا!

چھ!...... بچّوں کو دُودھ پلانا۔ کسی بھی دودھ دینے والے جانور کا۔

پانچ!...... اب شاید ہمسائی سے بات چیت بلکہ گزارش...... چینی کا ایک

---

[1] تمام حوالے الگزنڈر سولزنتسن کے ناول "آئیون ڈینیسووچ کی زندگی میں ایک دن" سے لیے گئے۔

پیالہ اُدھار جب تک اگلا راشن نہ مل جائے۔

چار!...... مُنہ کی چھکنی گیلی لکڑیوں کو سُلگاتی ہوئی۔

تین!...... توسے پر بکھرا اسفید آٹا اب آہستہ آہستہ حِدّت سے بھورا ہو رہا ہے۔

دو!...... اب پتہ نہیں کیا کر رہی ہوگی؟

ایک! اب بھی پتہ نہیں......

زیرو!...... اب!

اُسی لمحے رضائی اس کے بدن پر سے ایک جنازے کی طرح اُٹھی اور پھر قدموں میں ڈھیر کر دی گئی "غضب! غضب! غضب!— دوپہر ہونے کو آئی جن کو یہاں سُولی کی فکر ہوتی ہے وہ مُنہ اندھیرے اپنے کاروباری ٹھکانوں کی جانب چل دیتے ہیں تم جیسے نکمّے۔" روبرو اُس پر جھکی ہوئی آنکھیں غصّے سے اُبل رہی تھیں۔

"اُسی لمحے اس کا کمبل اور جیکیٹ ایک جھٹکے سے کسی نے اُتار پھینکے۔ آئیون نے اپنا کوٹ چہرے سے اُتارا اور جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے قید خانے کا محافظ تاتاری کھڑا تھا۔

"ایس۔ آٹھ سو چون" تاتاری نے اس کی سیاہ جیکیٹ پر سلی ہوئی سفید پٹی پر سے نمبر پڑھتے ہوئے غصّے سے کہا "تین دن کی مشقت" اگر آئیون کو کسی ایسے جرم کی سزا ملتی جو اُس سے سرزد ہوا تھا تو اُسے بالکل دُکھ نہ ہوتا۔ اُسے تو اس بات سے تکلیف پہنچی تھی کہ وہ تو ہمیشہ بقیہ قیدیوں سے بہت پہلے بیدار ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ محافظ تاتاری کے ساتھ بحث میں اُلجھنا بالکل فضول تھا۔"

بستر پر سے ٹانگیں سمیٹتے ہی اُس کے سامنے ناشتے کی ٹرے دھکیل دی گئی۔ اُس نے گردن جھکائی اور زنگ آلود ٹرے کو گھورنے لگا۔ وہ اب کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ اگلے دس منٹ کے لیے آزاد تھا۔ خالی الذہن ہو کر بیٹھ سکتا تھا۔ فضول قسم کی سوچوں

میں گم ہو سکتا تھا، کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچھ بھی؟ ہاں کچھ بھی...... لوگ کہتے ہیں مجسّم محبّت بنے رہو۔ اپنے ساتھی انسانوں کے سروں پر محبّت کا پانی انڈیلتے رہو تاکہ ان کے جسموں کے درخت سرسبز رہیں مگر یار رویہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ کبھی کبھار خدا کا کوئی نیک بندہ تمہارے سر پر بھی ایک آدھ بالٹی ڈال دے...... ہا ہا۔ سر کے بال چیخ رہے ہوں، دماغ میں دراڑیں پڑ جائیں تو بھی لگے رہو، محبّت کا پانی انڈیلنے۔ سراسر یک طرفہ کارروائی۔ جی نہیں شکریہ۔ اور یہاں سبزہ پانی بھی تو پیاسا ہو سکتا ہے بالآخر؟ یا نہیں؟ اور یہ نفسیات والے بھی خوب تجربے کرتے ہیں کہ جو جی میں آئے بول دو اور وہ ان اُلٹے پلٹے الفاظ کی مدد سے آپ کی شخصیت کے بخئے اُدھیڑ...... بخئے نہیں میرا خیال ہے ٹانکے بلکہ تُرپے...... ہا ہا تُرپے اُدھیڑ دینا...... مثلاً میں کیا کہوں گا۔ یعنی اُلٹ پلٹ الفاظ......

شروع ہو جاؤں؟ ہو جاؤ...... لو پھر...... دو آنہ...... چار آنہ...... قید خانہ۔ کمرہ...... لنگور...... لڑکی...... بلکہ ننگی...... چُپ...... کوئی سُن تو سکتا نہیں...... تو پھر ننگی لڑکی...... بکرے کی ران...... وہ گولی مارو...... آج کا دن کیسا ہوگا۔ کیا مطلب آج کا دن؟ ایک مرتبہ میں نے ڈائری خریدی۔ ایک سال کے بعد جب اُسے پڑھا تو معلوم ہوا کہ جیسے یکم جنوری کو جو کچھ ہوا اُس کی مہر بنوالی گئی اور بقیہ تین سو چونسٹھ صفحوں پر وہی ثبت کر دی گئی۔ ہوگا کیا؟ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا اور آئے گا آنے والا، بجز اس مت کرو گدھے کے بچّے...... ہا ہا ہا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟"

"جی...... کچھ نہیں"

"تمہارا خیال ہے میں احمق ہوں؟ کیوں ہنس رہے ہو؟"

"یقین کرو بس ایسے ہی...... پتہ نہیں۔"

"نکمّے لوگوں کے دماغ چل جاتے ہیں؟ چلو اب نکلو بھی گھر سے۔"

"ناشتے میں اگر کوئی خوبی ہوتی بھی تھی تو بس یہی کہ خوب گرم ہوتا تھا۔ لیکن آج آئیون کا حصّہ ٹھنڈا ہو چکا تھا، پھر بھی اُس نے

اُسے نہایت انہماک اور آہستگی سے کھایا..... نیند کے علاوہ تین
لمحے ایسے ہوتے ہیں جب ایک قیدی صرف اپنے آپ کے لیے زندہ
ہوتا ہے۔صبح ناشتے پر....... دس منٹ! دوپہر کے کھانے پر....
پانچ منٹ اور رات کے کھانے پر.....پانچ منٹ!
سب سے تلخ وہ لمحہ ہوتا ہے جب تم صبح سویرے مشقت کے
لیے باہر جاتے ہو.....تاریکی کی جانب..... بھوکے پیٹ....شدید
سردی میں! تم گنگ ہو جاتے ہو، کسی سے گفتگو کرنے کی خواہش تک
باقی نہیں رہتی۔"

"سٹیشن کو بس یہیں سے جاتی ہے؟ ایک آواز نے پوچھا۔
اس نے بھینچے ہوئے جبڑے علیحدہ کرنے کا جتن کیا مگر شاید روٹی کی بجائے اس نے
ناشتے پر اپریل ٹوائٹ چبایا تھا۔ بھینچے رہے۔اس نے بے دھیانی سے سر ہلا دیا۔عمودی
اور اُفقی خطوط کے درمیان کہیں۔بس سٹاپ پر کھڑے تمام لوگ اُسی کا چہرہ لیے ہوئے تھے۔
ایک تیز رفتار کار میں سے ایک ہاتھ بلند ہُوا۔کوئی جاننے والا تھا۔
کون؟ پتہ نہیں۔روزانہ اسی وقت وہ ہاتھ بلند ہو کر غائب ہو جاتا۔ چہرہ دیکھنے کی
نوبت ہی نہ آتی۔

"ایک آگ تاپتے ہوئے شخص سے آپ کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ وُہ
سردی میں ٹھٹھرنے والے ایک شخص کے خیالات کو سمجھ لے.....ایک
قیدی کے خیالات، وہ بھی آزاد نہیں ہوتے، ایک ہی شے کی
جانب بار بار پلٹتے ہیں۔صرف ایک ہی آئیڈیا ذہن میں سر سراتا
ہے۔کیا محافظ میرے گدے میں سِلی ہوئی روٹی برآمد کر لے گا؟
کیا اگر میں آج جھوٹ موٹ بیمار ہو جاؤں تو وہ مان لیں گے؟"

مختصر دکان کا دروازہ کھولا تو سیلے فرش پر چوہوں کی مینگنیں چپکی ہوئی تھیں۔
اس نے ناک کو چٹکی میں دبایا اور منہ کے راستے سانس لیتے ہوئے جھاڑو سے فرش

صاف کرنے لگا۔اب گرد بھی اُٹھ رہی تھی۔منہ کھلا رہے تو حلق میں داخل ہوتی ہے۔
ناک سے سانس لینے میں وہی قباحت کی بُو آتی ہے۔پسند کیجیے خواتین و حضرات!
بُو یا گرد؟ اور اگر آپ دونوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سانس لینا مکمل
طور پر بند کر دیجیے۔نروان اور شانتی۔اللہ اللہ خیر صلّا۔مگر اُسے فی الحال نروان
نہیں چاہیے تھا۔بُو زیادہ ہوتی تو منہ کھُل جاتا، گرد کا غبار حلق میں اُترتا تو ناک
پچک جاتی۔صفائی سے فارغ ہو کر اُس نے مختلف ڈبوں، پیکٹوں اور بوتلوں کو
جھاڑن سے اچھی طرح جھاڑا اور پھر اپنے بوسیدہ گدے پر بیٹھ گیا۔
"بھائی چار آنے کی میٹھی گولیاں" پہلا گاہک۔
"مسٹر بلیڈوں کا ایک پیکٹ"
شاید وہ پہلا گاہک ہی تھا جسے اُس نے بلیڈوں کا پیکٹ دیا تھا کیونکہ اُسے
وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہُوا۔نزدیکی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی اس
نے بازار کی جانب پیٹھ کر کے کھانے کی پوٹلی کھول لی۔

"آئیون نے آسمان کی جانب دیکھا اور حیرت سے اُس کا منہ
کھُل گیا۔سُورج دوپہر کے کھانے کی جگہ پہنچ چکا تھا...جب
تم کام میں جُتے ہوئے ہو تو وقت کس طرح پرواز کرتا ہے؟
تم کوئی لفظ کہنے کے لیے لب کھولو تو اس سے بھی پہلے دن گذر
جاتا ہے۔صرف دن.....لیکن سال وہ کبھی نہیں گزرتے۔ان کا
ایک لمحہ بھی نہیں گزرتا۔"

لیبر انسپکٹر اس کی پیش کردہ بوتل اندر کھینچ کر بولا۔"تم ہفتہ وار تعطیل کس روز
کرتے ہو؟"
"تعطیل؟ جناب اگر کوئی فوتیدگی وغیرہ ہو جائے تب کر لیتا ہوں ورنہ تو
نوبت ہی نہیں آتی۔"
"لیبر قانون نمبر فلاں کے تحت ایک چالان..... ملازموں کو ہفتے میں ایک

چھٹی دینا لازمی ہے۔"

"مگر جناب میرا تو کوئی ملازم نہیں ..... میں خود ....."

"چھت سے لگا ہوا یہ پنکھا جھول رہا ہے کسی وقت بھی گر کر دکان میں کام کرنے والوں کے لیے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ دوسرا چالان۔"

"لیکن جناب میں تو خود ....."

"کیا تم سمجھتے ہو کہ حکومت تمھاری بہبود کی ذمہ دار نہیں ہے۔" انسپکٹر حقارت سے بولا "قوانین تمھاری بہتری کے لیے ہی نافذ کیے جاتے ہیں ..... اور انہی قوانین کے تحت اس دکان کا فرنیچر یعنی یہ کرسی جس پر میں بیٹھا ہوا ہوں بے حد بوسیدہ ہے لرز رہی ہے ..... تیسرا چالان"

اس کا بایاں بازو ایک بھک منگے کی طرح انسپکٹر کی جانب اٹھا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ میں پڑے دس کے نوٹ پر رکھا کانپ رہا تھا۔ بس تھوڑی سی ہمت، ذرا سی جرأت، یہ نوٹ ہتھیلی میں سمیٹ کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دو۔ وہ رجسٹر بند کر کے چلا جائے گا غلطی اُسی کی تھی۔ نیا انسپکٹر آیا تو بازار میں ایک دکاندار نے اس کے نائب کی حیثیت اختیار کر لی اور بقیہ دکانداروں کو کہہ دیا کہ بیس روپے مہینہ ادا کرتے رہو، صاحب شریف آدمی ہے تنگ نہیں کرے گا۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ مجھ پر قوانین کا اطلاق کیونکر ہو سکتا ہے، میں اکیلا اس دکان کو چلاتا ہوں۔ بھلا میں خود ..... بہرحال اب اس کے سامنے بیٹھا انسپکٹر صفحے کے صفحے سیاہ کیے جا رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی بدستور نوٹ پر جمی ہوئی تھی ..... بس تھوڑی سی جرأت کا مظاہرہ ..... مگر یہ جرأت آئے کہاں سے؟ گلے سے لے کر دو فٹ پرے انسپکٹر کے ہاتھ تک ایک ایسی خلیج حائل تھی جسے وہ کبھی عبور نہ کر سکا ..... بھلا لوگ اتنی آسانی سے نارمل وہ کر مسکراتے ہوئے یہ فعل کیسے سرانجام دے لیتے ہیں ..... اُس لمحے جب ایک طرف نوٹ ہوتا ہے اور دوسری جانب ہاتھ ..... کس طرح اس نوٹ کو وہ خلیج عبور کرائی جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن بند نہیں ہو جاتی؟ بند ہتھیلی پھول کر غبارہ تو نہیں بن جاتی؟ سر پر سینگ تو نہیں اُگ آتے؟ دانت ہونٹوں کو چھید کر چمکنے تو نہیں لگتے؟ آخر کیا ہوتا ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ ڈرپوک اور نکما تھا کیونکہ رگوں کی ہتھیلیاں مقناطیس ہوتی ہیں، ادھر ہاتھ بڑھایا اُدھر نوٹ چمٹ گیا اور دوسری ہتھیلی کے نزدیک آتے ہی نوٹ ہوا میں تیر کر اس ہاتھ سے جا لگا۔ مگر اس کا ہاتھ ..... نوٹ پر پڑا پڑا ٹھنڈا ہوتا گیا۔ اور انسپکٹر چالان لکھتا رہا۔

"پیسہ تو بہت آسانی سے بنایا جا سکتا ہے اور بہت تیزی سے۔ اور یوں کتنے ستم کی بات ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سے، اپنے دوستوں سے اس معاملے میں بہت پیچھے رہ جاؤ ..... بس اس کے لیے انسان کو لوگوں کے ساتھ گھل مل کر، دوستی سے رہنا پڑتا ہے۔ جاننا پڑتا ہے کہ ایک آدھ ہتھیلی پر مکھن کیسے لگایا جائے۔ اگرچہ آئیون نے اس زمین کو چالیس برس تک روندا تھا، اگرچہ اس کے آدھے دانت گر چکے تھے اور سر بالکل گنجا ہو چلا تھا مگر اس نے آج تک رشوت نہ لی تھی؛ نہ دی تھی اور نہ ہی ایسا کرنا وہ سیکھ سکا تھا۔ اس قید خانے میں بھی نہیں۔"

"بھائی صاحب کیا وقت ہوا ہے؟" ہانپتے ہوئے پوچھا۔

بھائی صاحب نے کیا تمھارے پاس گھڑی نہیں ہے نظروں سے اُسے دیکھا اور "دس منٹ۔ آٹھ بجنے میں۔"

"آٹھ بجے کی بس چاہیے۔ آٹھ بجے کی بس درکار ہے۔ دے دے بابا آٹھ بجے کی بس۔"

"کسی قیدی نے آج تک کوئی کلاک یا گھڑی نہیں دیکھی تھی۔ آخر اُسے ان کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔ اُسے تو صرف یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ کیا چھٹی کا الارم آج جلد بج جائے گا؛ کھانے میں کتنی دیر ہے؟ اور پھر سونے کے لیے کب حکم ملے گا؟"

"بھائی صاحب کیا وقت ہوا ہے؟" مزید ہانپتے ہوئے پوچھا۔

ان بھائی صاحب نے بھی اُسے، کیا تمھارے پاس گھڑی نہیں ہے، نظروں سے دیکھا اور "پانچ منٹ آٹھ بجنے میں۔"

آٹھ بجے کی بس چاہیے۔ آٹھ بجے ایک۔ آٹھ بجے دو۔ مرے بابا آٹھ بجے کی بس۔ ورنہ دوسری بس نو بجے آئے گی اور نو بجے والی بس دس بجے گھر پہنچائے گی اور دس بجے...... کھیل ختم، وہ سو چکی ہوگی۔ خوابیدہ بلا کو کون جگائے! خود ہی کھانا گرم کرنا پڑے گا اور بعد میں برتن بھی صاف کرنے ہوں گے۔ ہاں اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ اُن آنکھوں سے فرار حاصل کر کے چپاتی سے کٹورے کو اس طرح صاف کر دیتا ہے کہ دھندلی چکنائی کی ایک تہ کے علاوہ کٹورا لشکارے مارنے لگتا ہے۔ ایک کٹورا سالن اور تین چپاتیاں۔ پیٹ تو نہیں بھرتا ان سے، جب تک کہ کٹورے کو چاٹا نہ جائے۔ اور ظاہر ہے یہ فعل اُس کے سامنے تو نہیں سر انجام دیا جا سکتا......

آٹھ بجے کی بس...... آٹھ بجے...... اس کے پاؤں جو پہلے ہی تیزی سے حرکت میں تھے اب باقاعدہ دوڑنے لگے۔ سارا دن دکان پر بیٹھک کرنے کے بعد اب اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ گندی نالی میں بہتے ہوئے پانی پر سے وہ اس تیزی سے گزرا جیسے تیر جانا چاہتا ہو...... ورنہ پھٹے ہوئے تلوے کے اندر پانی گھس کر گدگدی کرے گا۔ مگر آٹھ بجے کی بس...... شاباش بھاگو...... تم اسے پکڑ لوگے۔

"دنیا میں ایسے لوفر بھی موجود ہیں جو اپنی مرضی سے کسی سٹیڈیم
میں دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن شیطانوں کمبختوں کو چاہیے
کہ وہ سارا دن مشقت کرنے کے بعد دوڑ کے دیکھیں۔ دُکھتی ہوئی
کمر کے ساتھ، بھیگی جرابوں اور پھٹے ہوئے بوٹوں کے ساتھ اور
...... شدید سردی میں۔"

بس کے دروازے بند تھے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر اگلی نشست پر بیٹھے مزے سے سگرٹ کھینچ رہے تھے۔ دھواں خالی بس میں کُہر کی طرح پھیل رہا تھا۔ کچھ لوگ بند کھڑکیوں کے شیشوں پر ناکیں چپکائے خالی نشستوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے دوسری جانب ایک پُراسرار طلسم زدہ وادی ہو جس میں داخل ہو کر

وہ اپنے تمام تر دُکھوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔ یہ بس انھیں گھر کی بجائے کہیں اور لے جائے گی۔ باقی مسافر بند دروازے پر ہتھیلیاں جمائے ہانپ رہے تھے تاکہ اس کے کھلتے ہی، اس سم سم کے وا ہوتے ہی وہ چھلانگیں لگا سکیں...... اُن کی حیات کا ایک ہی مسئلہ تھا۔ اس دروازے میں سے اندر داخل ہونا...... وہ بھی سر نیوڑھا کر اس ہجوم میں گھس گیا، نیچے ہی نیچے، ہاتھ پھیلائے تاآنکہ اُس نے بس کی باڈی کا لمس محسوس کیا اور پھر ساکت ہو گیا۔

"محافظوں نے دروازے نہ کھولے۔ اُن کو اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا۔
انھوں نے قیدیوں کو دروازوں کے پیچھے دھکیل دیا مگر قیدی سب
کے سب دروازوں کے ساتھ ہونقوں کی طرح چمٹے رہے کہ شاید
اس طور جلد باہر نکلا جا سکے۔ چھٹکارا ہو جائے۔"

اُس نے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں اُٹھا کر رضائی کو اپنے اُوپر تان لیا، جیسے کوئی جادوئی قالین فضا میں معلق ہو۔

"ہلکی ہو گئی ہے" اس نے ایک جھٹکے سے بازو اور ٹانگیں سمیٹ لیں اور رضائی دھپ سے اُس پر آ گری "کم از کم دو سیر مزید روئی اُس میں کھپائی جائے تب سردیاں گزریں گی۔" اس نے پاؤں کا انگوٹھا چلا کر صبح والے سوراخ کو تلاش کیا مگر ناکام رہا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ چھ جسموں سے خارج ہونے والی حدت بے حد آسودگی دینے والی تھی۔

وہ اندھیرے میں پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا بغیر کسی تغیر و تبدل کے، ایک ہی ڈگر پر، کنوئیں کے بیل کی طرح...... پہلے پہل تو یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ پوری پوری رات وحشت میں آنکھیں جھپکاتا گزار دیتا مگر اب تو خواہش بلکہ خواہشوں کی فصل کا نام و نشان نہ تھا۔ حیاتی کا کھیت تیز اور نوکیلی دب سے بھرا پڑا تھا۔ کہتے ہیں ایک ہی شخص کو باقاعدگی سے دیکھتے رہو تو اُس کے چہرے

"آئیون چھت کو خاموشی سے گھور رہا تھا۔ اب تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ
آزادی کا خواں ہے بھی یا نہیں۔ پہلے پہل تو یہ خواہش بے حد شدید تھی۔ ہر

شب وہ بستر پر لیٹ کر اپنی قید کے دن گنتا کتنے گذر گئے؟ کتنے باقی ہیں اور پھر وہ گنتی سے اُکتا گیا...... ایک شب اس پر یک دم منکشف ہُوا کہ اُس جیسے لانسان کو تو کبھی بھی گھر نہیں جانے دیا جاتا۔ وہ ہمیشہ جلا وطن ہی رہتا ہے اور پھر کیا اس کی زندگی اُس گھر میں اِس قید خانے سے کسی طور بہتر بھی ہو گی یا نہیں...... کون کہہ سکتا ہے؟ اس کی قید میں تین ہزار چھ سو ترپن روز باقی تھے۔ پہلا الارم بجنے سے آخری الارم بجنے تک۔ قید میں تین روز کا اضافہ لیپ سالوں کی وجہ آئیوان مطمئن ہو کر سو گیا۔ اس روز وہ بے حد خوش قسمت رہا تھا۔ انھوں نے اُسے کوٹھڑی میں نہیں ڈالا تھا۔ اُسے کھانے کے لیے ایک کے بجائے دو پیالے ملے تھے۔ اُس نے ایک دیوار کی تعمیر کی تھی اور پوری طرح لطف اندوز ہُوا تھا۔ اُس نے کیمپ میں لوہے کا ایک ٹکڑا اسمگل کر لیا تھا۔ اُس نے قیدیوں کے چھوٹے موٹے کام کر کے کچھ پیسے بنا لیے تھے۔ اُس نے تھوڑا سا تمبا کو خریدا تھا اور وُہ بیمار نہیں ہُوا تھا۔ اُس کا دن مکمل ہو گیا تھا۔"

وہ کیا کہاوت ہے کہ ایک شخص کے پاس جُوتے نہیں تھے اور پھر اُس نے ایک اپاہج شخص کو دیکھا اور پھر پتہ نہیں ہُوا...... شکر کرو رب کا قانع رہو، اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لو کہاوتوں والے بزرگ یہی کہتے ہیں۔ میں اب بھی بہت سوں سے بہتر ہوں...... کتنوں سے؟...... مجھے کیا پتہ۔ بس بہتر ہوں...... سو جاؤ...... وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔ اُس روز وہ بے حد خوش قسمت رہا تھا۔ بیوی کے ساتھ کوئی خوفناک قسم کا جھگڑا نہیں ہُوا تھا۔ اس دکاندار نے بعد میں اپنے طور پر انسپکٹر کو بیس روپے دے کر اس کے تمام چالان کٹوا دیئے تھے۔ کھانے کے بعد اُسے ایک پیالہ چائے بھی مل تھی یہ نو بجے کی بجائے آٹھ بجے والی بس پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا تم اُس کی کِن کِن نعمتوں کا شکر ادا کرو گے! اُس کا دن مکمل ہو گیا تھا۔ وُہ مطمئن ہو کر سو گیا۔

آکٹوپس

اب اُسے اپنا ہر قدم اُکھاڑنا پڑ رہا تھا جیسے وُہ کیچڑ میں بھاگ رہا ہو سپورٹس شُوز میں پیک شدہ پاؤں وزنی ہو رہے تھے۔ بدن آگے نکلتا پاؤں گھسٹتے پیچھے رہ جاتے، وندان ساز کے شوکیس میں رکھی بتیسی بھینچی ہوئی، دماغ کے خلیوں کو ایس۔ او۔ ایس بھیجا ہوا...... صرف چند قدم اور...... اذیت کے چند لمحے اور تمھارا پورا چکر مکمل ہو جائے گا تم ورزش کے لیے ہر صبح اس باغ کے گرد لپٹی ہوئی سڑک پر سُستی سے دوڑتے ہو، پچھلے کئی برسوں سے، ہر روز چکر مکمل ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ آج نہیں ہوگا مگر ہمیشہ ہو جاتا ہے۔ آج بھی یہ چکر مکمل کرنا ہے۔ تاریکی ہے مگر تمھیں اِس سے غرض، پاؤں اپنا رستہ پاتے ہیں...... صرف چند قدم اور...... شاباش۔ گردن کے بالوں سے ٹپکتے چھوٹے چھوٹے آبی لنگور پُشت پر چھلانگیں لگا رہے تھے، پسینے کے بُلبلے ماتھے سے پھُوٹ رہے تھے۔ ناک پر دھار بہہ رہی تھی...... چند قدم اور۔

اور وُہ اندھیرے میں قدم گھسیٹتا بھاگتا رہا۔

"تاریکی کا دھواں ابھی تحلیل نہیں ہوا تھا۔

درخت، پتے، پودے، گھاس سیاہی میں ملفوف گمنام تھے۔

ایک کنکر پاؤں تلے آیا اور اُس کی ٹانگیں مسمار ہوتے ہوتے بچیں۔ عبور کے راستے میں چھوٹی سی رُکاوٹ اور بدن کا کچّا گھڑا تھکاوٹ کے پانیوں میں گھُلنے لگا...... چند قدم اور...... اُس کے کانوں میں فوارے کا مدھم بہاؤ اُترا۔ کلب کی عمارت کے سامنے وہ فوّارہ تھا جہاں سے بیس منٹ پیشتر وہ سپورٹس شوز پر تیرتا ہُوا نکلا تھا، چکر ختم ہونے کو تھا، شاباش صرف دس بارہ قدم اور...... ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ...... چھ...... ساتویں قدم نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وُہ لڑکھڑایا اور رہوڈز کے مجسمے کی طرح اکڑوں حالت میں منہ کے بَل گرنے لگا...... وُہ ڈوبنے لگا۔ گہرائی میں اُترتا بیٹھتا چلا گیا۔

آکٹوپس اپنا سیاہ جال پھیلائے منتظر تھا۔

اُس کے بدن پر سرسراتے ہوئے بے چین فیتے کَسے جانے لگے۔ ہزاروں زبانیں مسّاموں میں اُتریں اور پیاس بجھانے لگیں...... جونکوں کا جال بچھ رہا تھا۔ ٹانگوں اور بازوؤں کے گرد دائرے گھونٹنے کے بعد اُس کی گردن پر سیاہ مفلر لپٹے اور اُس نے منہ کھول کر زبان باہر نکال دی۔ بدن پر مکمل گرفت کے باوجود آکٹوپس اُس کے منہ پر اپنی پلاسٹک ہتھیلی چپکانے میں ناکام ہو رہا تھا، وُہ اس کی زبان سے خوفزدہ تھا۔ ہتھیلی منہ کی طرف بڑھتی اور زبان کی نوک سے چھُوتے ہی پسپا ہو جاتی۔ موت کا معمار خاموشی کی اینٹیں مُنہ کے آگے چُنتا مگر زبان کی گرمی انھیں پگھلا دیتی۔ اُس کی زبان آزاد رہی...... اُوپر سمندر پر شاید ایک پُرانی کشتی تھی جس کے ماہی گیر اپنے مُشقتی ہاتھوں، چنڈیوں سے بھری ہتھیلیوں میں زنگ آلود ٹوٹے ہوئے برچھے بھینچے اس آکٹوپس کے سطح پر آنے کے منتظر تھے مگر آکٹوپس تو کبھی سطح پر نہیں آتا، وہ اپنی تاریک سلطنت میں ہی رہتا ہے۔ جب تک وُہ کشتی گہرائی میں ڈوب کر اس تک نہیں پہنچتی وہ محفوظ ہے اور بدنوں کو گرفت میں لیتا رہتا ہے۔ سرسراتے ہوئے بے چین فیتے، ہزاروں زبانیں بدن پر پلستر کی

صورت ڈھکتی گئیں۔

ساتویں قدم نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے، وُہ لڑکھڑایا اور رہوڈز کے مجسّمے کی طرح اکڑوں حالت میں مُنہ کے بَل گرنے لگا...... تھکاوٹ اور پسینے سے بھیگتے بدن کی انگوری بیل کیکر کے کانٹوں پر لپٹنے لگی۔ روئیں روئیں میں کانٹوں نے جال بچھایا۔ تن کی لاکھوں آنکھوں میں سلائیاں کھُبنے لگیں۔ کانٹوں کے آکٹوپس میں سے نکلنے کے لیے اُس نے ہاتھ اور ٹانگیں پھیلا دیں...... کھُلی ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی گئیں، لرزتے تلووں میں کانٹے داخل ہو گئے، صرف چہرہ کانٹوں کی سرحد کے پار تھا۔ گردن میں سُولوں کی سرنجیں اُتریں اور اُس نے منہ کھول کر زبان باہر نکال دی۔ بدن پر سُوئیوں کی فصل بونے کے باوجود کانٹے زبان کی نوک سے خوفزدہ رہے۔ اُسے چھُوتے ہی گھاس کے سبز تنکے کی طرح نرم ہو کر پسپا ہو جاتے۔ موت کا معمار خاموشی کی اینٹیں منہ کے آگے چُنتا مگر زبان کی گرمی اُنھیں پگھلا دیتی۔ اُس کی زبان آزاد رہی...... بدن کے روئیں روئیں سے خُون رِس رہا تھا۔ خاردار تار کے گولے نے اُسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وُہ جالے میں لٹکتی مُردہ مکھی کی طرح بے حس پڑا رہا مگر اس کی رگیں، اُس کے خُلیے سوال کرتے رہے...... یہ آج صبح اندھیرے میں راستوں پر خاردار تار کے گولے کِسنے بچھا دیئے ہیں؟

یہ اُس روز کی صبح تھی جب ذی ہوشوں کو خاکی کفن پہنائے گئے۔

دیرِ قاسم کے تمام مرد کھیتوں میں کام کرنے کے لیے جا چکے تھے جب فوجی گاڑیں میں داخل ہوئے اور لاؤڈ سپیکروں پر اعلان کیا کہ اب جو نفس کھُلی فضا میں آئے گا اُس کا سانس بند کر دیا جائے گا۔ خاردار تار کے پیچھے کواڑوں اور کھڑکیوں پر نفرت کی سانسیں لیتے ہوئے بچّوں اور عورتوں نے سُنا اور بے بسی کا تھوک نگلا۔ دیرِ قاسم کے مرد اُن کھیتوں میں جھُکے ہوئے تھے، جو بستی سے پَرے نیم صحرائی ٹکڑے کے اختتام پر سبز ہو رہے تھے اور لاؤڈ سپیکروں کی آواز کے دائرے سے دُور تھے۔ بچّی کے بال سنہری تھے اور اس کا باپ بھی کھیتوں میں جھُکا ہُوا تھا۔ اُس نے اعلان سُنا اور اپنے آپ کو پچھلے صحنوں اور باغیچوں میں پوشیدہ کرتی ہوئی

اُسے خبر کرنے کے لیے گاؤں [illegible] باہر نکل گئی۔ شام ہوئی۔ دیر قاسم کے تھکے ہوئے توانا جسم اپنی مٹی کی چاہت میں گاؤں کو لوٹنے لگے۔ پہلے گھر کی پہلی اینٹ کو پار کرتے ہی جلتا لوہا

اُن کے سینوں کی زینت بنا اور وہ سب خاردار تار کے آکٹوپس میں جکڑے گئے.... اُنھوں نے کرفیو کی خلاف ورزی کی تھی، اعلان تو ہو چکا تھا...... چار ماہ بعد ایک بچی کھیت میں سوئی ہوئی ملی، اُس کے ڈھانچے پر ماس کی دھجیاں تھیں اور اُس کے سنہری بال دھرتی پر بکھرے ہوئے تھے اور اُن میں سے گندم کی سنہری بالیاں پھوٹ رہی تھیں۔

اب اُسے اپنا ہر قدم اُکھاڑنا پڑ رہا تھا۔ جیسے وہ کیچڑ میں بھاگ رہا ہو۔ سپورٹس شوز میں پیک شدہ پاؤں وزنی ہو رہے تھے۔ بدن آگے نکلتا مگر پاؤں گھسٹتے پیچھے رہ جاتے.... صرف چند قدم اور..... شاباش صرف چند قدم...... حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خاردار تار کے زخموں میں سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا تھا۔ اُس نے کل صبح واپس جا کر غسل خانے میں اپنے سارے جسم کو ایک کوڑھی کی طرح ٹٹول ٹٹول کر دیکھا تھا، خون نہ تھا، چبھن کے ہزاروں نقطے ابدیت تھے۔ مگر اُن کے نشان نہ تھے صرف احساس کی نوکوں کی فصل تھی، ...... البتہ آج وہ بستر سے تب برآمد ہوا جب سیاہی دُور ہو چکی تھی، آج وہ اندھیرے میں نہیں دوڑنا چاہتا تھا، اپنا راستہ دیکھ کر طے کرنا چاہتا تھا...... صرف چند قدم اور ...... اُس کے کانوں میں قوّالے کا مدھم بہاؤ اُترا اور پھر کلب کی عمارت کا پہلا اہرام نمودار ہُوا۔ اُس نے آنکھیں پاؤں پر رکھ دیں جو ایک بوڑھے خچر کی طرح بھاری ہو رہے تھے۔ آنکھیں اُٹھائیں تو راستے کو کانٹوں کی فصل نے روک لیا۔ باربڈ وائر سڑک کے آر پار بچھی ہوئی تھی...... اس نے اپنے پیچھے آنے والوں کو دیکھا جو خاردار تار کو حائل دیکھ کر ٹھٹھکتے، نامردی سے سر ہلاتے اور پھر چپکے سے راستہ بدل لیتے۔ کسی نے تار کے ہونے اور نہ ہونے پر دماغ کو بوجھل نہ کیا، اعتراض نہ کیا بس لاپروائی سے راستہ بدل لیا۔ کیا یہ خاردار تار واقعی سڑک کے آر پار بچھی ہے یا میرا واہمہ ہے۔ صرف مجھے ہی دکھائی دے رہی ہے؟ دوسری آنکھوں سے سوا میری آنکھوں کے لیے۔ وہ احتیاط سے اُس کے

قریب بیٹھ گیا اور آہنی ببول پر بے یقینی کا ہاتھ رکھا.... اُس کے پورے وجود کے زخم، لاکھوں پوروں کے زخم بلبلانے لگے...... اُس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ کانٹوں کی نوکوں پر سُرخ نقطے تھے جیسے ناگ پھنی پر نامعلوم پھول ہوں۔ اُس نے ہتھیلیوں کے آئینے سامنے کیے، اُن پر خون نہ تھا، بے نشان تھیں۔ تلوے چھوئے تو بھی انگلیاں سادہ ہی رہیں؛ رنگی نہ گئیں۔ چبھن کے لاکھوں بُلبلے پھوٹ پھوٹ کر بہتے رہے مگر بے نشان..... وہ اُٹھ کھڑا ہُوا...... لوگ دامن بچا کر جا رہے تھے دوسرے راستوں پر، مگر وہ اُسی راستے پر چلنا چاہتا تھا جس پر وہ آج تک چلتا آیا تھا کیونکہ وہ راستہ اُس کا اپنا متعین کردہ تھا، کسی کو یہ حق نہ تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر اُسے بدل دے۔ اُس نے باربڈ وائر کو پار کرنے کے لیے پاؤں اُٹھایا...... ایک دھماکہ ہُوا اور باغ کے پرندے درختوں سے رخصت ہو گئے...... اُس نے جلدی سے اپنا جسم ٹٹولا، نمی صرف پسینے کی تھی، تھکاوٹوں کے پسینے کی۔ اُس نے پھر پاؤں اُٹھایا، ایک اور دھماکہ ہُوا... وہ پیچھے ہٹ گیا...... تاریکی میں بچھائی جانے والی تار صرف تاریکی میں ہی عبور کی جا سکتی ہے، آج نہیں تو کل......

سڑک کے پہلو میں پھولوں کی کیاریاں تھیں، وہ نیچے اُترا، اپنے چار چپھیرے ایک حفاظتی نظر پھیلائی اور ایک پھول کے ڈنٹھل کو چٹکی میں دبا لیا...... تنگ مکانوں کی غربتی چھتوں پر بارشوں میں صرف گھاس کے تنکے اُگتے ہیں...... اُن شکستہ فرشوں اور اُکھڑتے ہوئے پلستروں والے کمروں میں ایک پھول بدہیئت عورت کی گود میں ایک زنگین بچہ ہوتا ہے۔ وہ ہر روز باغ میں سے ایک پھول کو جو رنگین بچہ ہے اپنی بدہیئت عورت کے پاس لے جاتا جو اُس کا کمرہ ہے...... اُس نے چار چپھیرے ایک حفاظتی نظر پھیلائی اور ایک پھول کے ڈنٹھل کو چٹکی میں دبا لیا...... پنکھڑیاں دھوپ میں کھڑے موم کے ہیلی کاپٹر کے پَروں کی طرح ڈوڈے سے نکل کر علیحدہ ہوئیں اور پودے کی جڑ کے چاروں طرف براجمان ہو گئیں، پھول نے اپنی بناوٹ زمین پر سجا دی....

اُس نے ایک اور تنے کو چٹکی میں لیا۔ پنکھڑیاں ٹوٹ کر گر گئیں۔ ایک اور ڈنٹھل کو پکڑ کر اُس نے جلدی سے پھول توڑنے کی کوشش کی...... اس پھیرو کے پنکھو بھی فوراً جھڑ گئے...... شاید کیاری میں مرجھاہٹ مرنے کو آ گئی ہے...... دوسری کیاری میں پھول توانائی سے تنے تھے، اُس نے ڈنٹھل ہاتھ میں لیا اور یہ پرندہ بھی اپنے پَر چھوڑ گیا...... اُس نے ہراساں ہو کر اپنی اُنگلیوں کو دیکھا جن کا لمس مُرجھاہٹ بن گیا تھا...... اُس کے ماتھے پر سراسیگی کے پسینے تیرے...... لُولے، لنگڑے، بانجھ، اندھے، نامرد وسوسے اُس کے بدن پر بیساکھیوں سے گھسٹنے لگے۔ شکاری کتوں کی بُو اُس کے نتھنوں میں اُتری اور وُہ آنکھوں سے خوف اُگلتا تیزی سے گھر لوٹ آیا۔

بدہیئت عورت جو کمرہ تھی اُس کی گود میں ایک رنگین بچہ تھا جو پھول تھا، اچار کے خالی ڈبے میں تنہا تصویر بنا پھول......

اُس نے اپنی دونوں اُنگلیاں آنکھوں کے سامنے حاضر کیں، اُنھیں جانچا، کیا ان میں آکٹوپس نے مرجھاہٹ بھر دی ہے؟ وُہ دبے پاؤں آگے بڑھا...... چٹکی سے ڈنٹھل کو چھُوا...... کچھ بھی نہ ہُوا، پنکھڑیاں قائم رہیں۔ اُس نے ڈنٹھل چھوڑ کر اپنی اُنگلیوں کو غور سے دیکھا اور پھر دھیرے سے ڈنٹھل کو چٹکی میں دبایا...... پھول موجود رہا۔

اُس نے اطمینان کا ایک سیلاب اپنے اندر کھینچا...... سب واہمے...! آکٹوپس ایک پیچیدہ واہمہ...... مُرجھاہٹ ایک اور واہمہ...... وسوسے اپنی اپنی بیساکھیاں چھوڑ کر کیخ بدن سے فرار ہو گئے...... سب واہمے...... ہاہاہا......

"فلاور میکنگ کلاس میں جانے کا کچھ تو فائدہ ہُوا۔ آپ روزانہ چوری چھُپے اس کمرے کے لیے ایک پھول توڑ لاتے تھے، میں نے آج کاغذ کا بنا کر سجا دیا...... اصلی لگتا ہے ناں؟"

لُولے، لنگڑے، بانجھ، اندھے، نامرد، وسوسے ہنہناتے ہوئے آئے اور اپنی بیساکھیاں سنبھال کر بدن میں چلنے لگے۔ رُوں رُوں سے اذیتیں پھوٹیں، ناگ پھنی کی فصل جسم سے

پھُوٹنے لگی، درد کے بُلبلے پھُوٹے اور پھٹتے گئے۔ ٹیسوں کی ایک باڑ سینہ چھید گئی، نوکوں کا ریلا چھاتی میں پناہ گزین ہوا۔ یہ تن اک ٹیس، اِس کے ہر رُوں میں لاکھوں ٹیسیں...... وُہ کراہتا ہُوا بستر پر لیٹ گیا۔ اور اُس کے تلووں، گھٹنوں، گردن اور کھُلی ہتھیلیوں میں سے میخوں کی گولائی کا خون آہستہ آہستہ رِسنے لگا۔

بادشاہ

اور جب وہیل کا جثہ آخری مرتبہ سطح پر اُبھرتا ہے تو ماہی گیر جان جاتے ہیں کہ وہ اب کبھی روپوش نہ ہو سکے گی۔ وہ ختم ہو چکی ہے اور وہ بوڑھی کشتی سے ٹیک لگا کر خون آلود ہتھیلیوں کو اطمینان سے پونچھتے ہیں اور اس کے سرخی سے لتھڑے سفید دھڑ پر "ہم جیت گئے" کی نظریں گاڑے سمندر میں سفر کا پہلا سگرٹ سلگا لیتے ہیں۔ وہ جان جاتے ہیں کہ وہیل اب عافیت کے پانیوں میں دوبارہ ڈبکی نہیں لگا سکتی۔ کیونکہ گوشت کے اس تیرتے ہوئے تودے کے گرد کا پانی پہلی مرتبہ ایک مخصوص رنگ کی سرخی میں رنگنے لگتا ہے۔ اُس کے چاروں اور سمند ر رُت سے بھر جاتا ہے اور وہ جان جاتے ہیں کہ سُرخ پھول کھل رہا ہے اور جب سُرخ پھول کھل جائے تو وہیل زندہ نہیں رہ سکتی۔ سانس کے پانی کا وہ فوارہ جو سمندر میں سے ایک آبی انار کی طرح پھنکارتا ہوا چھوٹتا تھا اب صرف سطح پر ایک سست چشمے کی طرح اُبلنے کی کوشش کرتا ہے مگر فوراً ہموار ہو کر مر جاتا ہے۔ وہیل سُرخ پھول کے درمیان گھر کر مُرجھاتی ہے اور مر جاتی ہے۔

سانپوں کی طرح شُوکتے سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی، اتنی حقیر، اتنی معمولی کہ ہونے اور نہ

ہونے میں سے نہ ہونے کی طرف مائل کشتی میں چند دُبلے پتلے جسم اور اُن کے پنڈلیوں سے بھرے محنتی ہاتھ اور اُن کے سامنے ایک وسیع چٹان۔ اتنی بڑی کہ سمندر کی جسامت کو بھی مختصر کرتی ہوئی مگر حرکت میں اور تباہی کی پھنکار لیے کشتیوں کو ویران کر دینے کی قوت کے ساتھ۔ وُہ اپنی مہین آنکھوں سے دیکھتی ہے اُس نقطے کو جو کہ کشتی ہے۔ اُس کے ساتھ مقابلے کی سعی میں ہے اور اُسے نیست و نابود کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔

پہلا بھالا اس کے جسم میں صرف چبھتا ہے اور وہ ایک لاپرواکروٹ بدل کر اُسے جھنجھوڑ دیتی ہے۔ دوسرا نیزہ کچھ دیر تک پیوست رہتا ہے اور اُسے قدرے جھنجھلاتا ہے تیسرا وار اس کے شفاف بدن میں پھیلتا ہوا زخم ڈال دیتا ہے۔ چوتھا نیزہ اُسی زخم میں سے خون کے پہلے قطرے کرید نکالتا ہے اور پھر ایک ایسا بھالا وہیل کے بدن میں کھبتا ہے جو چھوٹا ہونے کے باوجود انسانی بازوؤں کی طاقت میں نہا کر نکلتا ہے اور اس کے کروٹیں بدلنے، زیرِ آب جانے اور پھنکارنے کے باوجود علیحدہ نہیں ہوتا۔ جسم سے خون کا، اس کی زندگی کا اخراج وصول کرتا چلا جاتا ہے۔ اُدھر بھالے کے ساتھ بندھی ڈور وہیل کے وحشی سفر کو ناپ رہی ہے کہ وہ محنتی ہتھیلیوں میں چنگاریاں بھرتی۔ ان پر خونی راستے بناتی نکلتی جا رہی ہے۔ ماہی گیر اپنی خون سے رستی مٹھیاں اذیت کی شدت سے کھولتے نہیں، مضبوطی سے بند رکھتے ہیں۔ ڈور کو چھوڑتے نہیں کہ محنتی ہتھیلیاں بند مٹھیوں میں بدل جائیں تو پھر کبھی نہیں کھلتیں۔ وہیل زیرِ آب جاتی ہے موت سے خائف ہو کر، مہیب پانیوں میں روپوش ہو جانا چاہتی ہے مگر اُسے سانس لینے کے لیے کبھی نہ کبھی سطح پر آنا ہی پڑتا ہے اور سطح پر ایک آخری نیزہ اُس کا منتظر ہوتا ہے اور آخری نیزہ اپنی لشکتی ناک اُس کے جسم میں گاڑ دیتا ہے۔ وہیل کا جثہ آخری مرتبہ سطح پر اُبھر چکا ہے اور گہرے پانیوں کو بھی خبر ہو جاتی ہے کہ اب وہ ہمیشہ خالی رہیں گے اور اُس کے گرد کا پانی پہلی مرتبہ ایک مخصوص رنگ کی سُرخی میں رنگنے لگتا ہے اور اس غروب کو ماہی گیر سُرخ پھول کہتے ہیں اور وُہ اپنی بوڑھی کشتی سے ٹیک لگا کر خون آلود محنتی ہتھیلیوں کو اطمینان سے پونچھتے ہیں اور اُس کے سُرخی سے لتھڑے سفید دھڑ پر "ہم جیت گئے" کی نظریں گاڑے سمندر میں سفر کا

پہلا سگریٹ سُلگا لیتے ہیں۔

بس نمبر ۲ اکی کھڑکی سے باہر دائیں ہاتھ پر سمندر بے شرمی کی حد تک ٹانگیں پھیلائے سپاٹ لیٹا تھا اور رات کی سیاہ شہوت اس پر جھکی ہوئی تھی۔ سمندر کے اطمینان کے نیچے بے شمار وہیل مچھلیاں پوشیدہ تھیں سہمی ہوئی، سُرخ پھولوں سے خائف۔ اس کی سیاہ چادر پر اب تک کتنے سُرخ پھول کھل چکے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے اُنھیں کِھلانے کے لیے اپنی ہتھیلیاں زخمی کیں اور پھر سیاہ چادر پر سُرخ دھبے کیسے نظر آئیں۔ مگر ایک روز جب پورے سمندر پر گلِ لالہ کی فصل مکمل ہو گی تو ماہی گیر اپنی اپنی کشتیوں میں سوار بے خطر اس میں اُتر جائیں گے۔

"ٹن" میٹھی روٹی بیچنے والے نے ٹین پر سوٹی مار کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا اور اُس کی باچھوں کے سُکڑنے پر جھکا جھکا پاس چلا آیا "سینیور" اُس نے سرکنڈے پر لپٹی گلابی رُوئی آگے کر دی۔ پانچ پسیتے ادا کر کے اُس نے رُوئی کی نرمی کو اپنی ناک سے چھُوا اور مُنہ چلانے لگا۔

"اِس وقت بگلے نہیں ہوتے سمندر پر؟"

"نہیں ہوتے" رُوئی سے بھرے ٹین پر سوٹی سے ایک اور ضرب لگا کر وُہ اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

بس دو بجے دوپہر غرناطہ سے روانہ ہوئی تھی۔ ایلشے کے کھجوروں کے باغوں اور مُرسیہ کے چٹیل میدانوں میں اپنا بدبُودار دھواں چھوڑتی اب بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ تاریکی میں علی کانت کی سمت میں بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیور کی نشست کے عین اُوپر ایک ننھا سا بلب اور بقیہ بس اندھیرے میں ڈول رہی تھی۔ مسافروں کے ڈھلکے ہوئے سر اور ٹوٹتے بدن سو رہے تھے۔ صرف میٹھی رُوئی بیچنے والا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے گنجے سر کے گرد بادلوں کے گچھے لٹک رہے تھے جیسے اُون کی ٹوپی کو ذرا سا اُبلا ہوا انڈا رکھا ہوتا ہے۔ مسکراہٹ ایک مُردہ مینڈک کے کھُلے ہُوئے مُنہ

کی طرح تھی۔ چہرہ ایک ایسے بچّے سے مشابہ تھا جو دِنوں میں برسوں کی جھریاں طے کر کے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ کوئی مسافر پہلو بدلتا یا پل بھر کے لیے آنکھیں کھولتا تو وہ فوراً سوٹی سے ٹین کھڑکا کر رُوئی کا گولا ہاتھ میں لیے جھکا جھکا اُس کے پاس پہنچ جاتا "سینیور!"

نصبِ شب سے پہلے وُہ علی کانت کی روشنیوں میں داخل ہوئے۔ نیون سائن اور سٹریٹ لائٹس کے رنگ بس کے تاریک پیٹ میں بھڑکنے بجھنے لگے۔ مختلف رنگوں کے بے آواز پٹاخے مسافروں کے تھکے ہوئے چہروں پر پھٹتے رہے۔ ایک ویران اڈّے کے اندر گھُستے ہی بس نے ایک ہچکی لی اور خاموش ہو گئی۔ میٹھی رُوئی بیچنے والے بوڑھے بچے نے ٹین کو آخری مرتبہ کھڑکایا اور اپنی مینڈک مسکراہٹ سمیت پاؤں پسار کر ایک نشست پر سو گیا۔ مسافروں کی اکثریت نے بھی بس سے اُترنے کا تردّد نہ کیا بلکہ پہلو بدل کر پہلے کی نسبت زیادہ پُرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وُہ اُندلس کے اُن اُجڑتے ہوئے قصبوں سے آئے تھے جہاں تمام تر قابلِ کاشت اراضی کسی ڈیوک یا ڈچس کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے۔ ان شخصی ریاستوں میں گناہ بھی وہی کرتے ہیں اور اُن کا ثواب بھی لیتے ہیں۔ دہقان صرف زمین پر مشقت کرنے کا گناہ کرتے ہیں اور ظاہر ہے ایسے گناہ کا ثواب نہیں ہوتا۔ چنانچہ موسمِ گرما میں وہ ایک ٹڈی دَل کی صورت اس شہرِ سمندر پر یلغار کر دیتے ہیں اور غیر ملکی سیاحوں کے بُوٹ پالش کر کے، اُنھیں کناروں پر اُندلسی لوک گیت سُنا کر روٹی اور پیاز کا بندوبست کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ آج کی شب اِسی بس میں گزار کر وہ اگلی صبح علی کانت کے شفاف شہر میں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگیں گے۔

اُس نے اپنے سفری تھیلے کو ایک مُردہ کتّے کی طرح بس کے دروازے تک گھسیٹا اور پھر جیسے ایک نقلی عضو کو جسم پر باندھتے ہیں اُسے کندھوں پر سٹریپ سے جکڑ کر اڈّے سے باہر آ گیا۔

علی کانت کا ہالیڈے ریسارٹ رات کے اس پہر بھی زندہ تھا۔ ساحلی سڑک کے دونوں طرف پام کے درختوں کا ایک سلسلہ تھا جن کے درمیان میں کسی نو دولتیے کی کوٹھی کے رنگ برنگے چِپس کے فرشوں کی مانند لہریئے سے بنے ہوئے تھے۔ ان پر روشنیوں

کا چکا چوند عکس تھا۔ مورش حصار کے دامن میں لوگ ابھی تک سفید سوٹوں اور رہبٹر کیلیے گاؤنوں میں ملبوس شراب پی رہے تھے۔ ریستورانوں سے باہر سفید آہنی جنگلوں پر مکھیوں کی طرح چمٹے اندلسی اور قشتالوی دہقان تھے۔ پچکے ہوئے پیٹ اور عنابی رنگ کے چہرے، شراب نوشوں پر لالچی نظریں بچھائے ان کے لباس اور سامنے رکھے مشروب کے بارے میں بھنبھناتے ہوئے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سفید آہنی چار دیواری جسے پھاند کر وہ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ اور اُس چار دیواری میں بیٹھے بے فکرے جن کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس کے پار پچکے ہوئے پیٹ ہیں۔ عنابی رنگ ہیں۔ علی کانت کے پُرپیچ بالکونیوں اور سفید پینٹ کئے ہوئے فائیو سٹار ہوٹل ساحلی سڑک کے ساتھ ساتھ وہیل مچھلیوں کی طرح اُبھرے ہوئے، اُن کے بدن میں سے امارت کے بلند فوارے سانس کی مانند اُبل رہے تھے۔ پردمینید سے کے سرے پر دوسرے درجے کے ہوٹلوں کا سلسلہ تھا اور آخر میں جہاں ساحلی سڑک کی آخری تیز روشنی تھی وہاں تیسرے درجے کے مسافر خانے اپنی حیثیت کے مطابق کندھے جھکائے کھڑے تھے اور ان ہوٹلوں کے پیچھے اور دائیں اور بائیں ہاتھ پر علی کانت کا پُرانا قصبہ تھا۔ سُرخ چھتوں والا۔ ہوٹلوں کی سفید عمارتیں تین اطراف سے سُرخ چھتوں میں گھری ہوئی تھیں۔ صرف ایک جانب فرار کا راستہ تھا، سمندر کی جانب...... مگر سمندر میں تو گل لالہ کی فصل مکمل ہونے کو تھی۔

ہڈیوں کو سفر کی رُکی رُکی حرکت ابھی تک کچوکے دے رہی تھی اور بقیہ جسم کو تھکن کی ایک بڑی مٹھی برابر بھینچے جا رہی تھی۔ وہ قدموں کو گھسیٹتا چلتا رہا کہ کیمپنگ سائٹ شہر سے تین کلومیٹر باہر واقع تھی جیسے ہڑپہ اور موہنجوڈارو میں دستور تھا کہ غلاموں کی بستی ہمیشہ شہر سے دُور تعمیر کی جاتی تھی۔ اسی طور آج کے سیاحتی شہروں میں بھی کم حیثیت لوگوں کے لیے کیمپنگ کی جگہ شہر سے پرے ایک محفوظ فاصلے پر بنائی جاتی ہے۔

علی کانت کا سُرخ کھپریل سے ڈھکا آخری گھر اُس کے عقب میں چلا گیا۔ اب وہاں کنکری پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جن پر اِکا دُکا وِلاز کے مورش باغوں میں مدھم روشنیاں نمائشی پلکوں کی طرح جھپک جھپک کر دکھ رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ پر سمندر ابھی تک ساتھ دے رہا تھا۔ سمندر

گوپی چندا، بول میری مچھلی کتنا پانی؟ بول میری وہیل مچھلی تھکے ہوئے پاؤں سڑک پر پڑتے تو انھیں لگتا جیسے کوئی پیچھے سے سڑک کا فیتہ اُن کے نیچے سے کھسکاتا چلا جا رہا ہے اور وہ کہیں نہیں جا رہے، ایک ہی جگہ حرکت میں ہیں۔ تین کلومیٹر انتہائی طویل تو نہیں ہوتے مگر ہو گئے، اور جب بالآخر ختم ہوئے تو وہ ایک بند پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا جس پر اندھیرے میں دمکنے والی گلابی روشنائی سے "علی کانت کیمپنگ" تحریر تھا۔ گھر دیر سے لوٹنے والے بچے کی طرح اس نے پہلے تو ہولے ہولے ہتھیلی کو تختے پر بجایا اور جب اِس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو بے خوف ہو کر دھڑ دھڑ اُسے کوٹنے لگا۔ ایک طویل وقفے کے بعد کوئی نسوانی آواز تلخی سے بڑبڑاتی قریب آتی گئی اور پھاٹک کا ایک پٹ آہستہ سے وا ہونے لگا۔ چھوٹے سے چوہے سر اور وسیع تن و توش کی ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی اُس کے سامنے آگئی۔

"بارہ بجے کے بعد کیمپنگ میں داخلہ ممنوع ہے لیکن اب تم آگئے ہو تو آجاؤ۔"

"بس دم لینا چاہتا ہوں اور پھر اپنی راہ لوں گا۔"

لیکن وہ سُن نہیں رہی تھی۔ بس تیزی سے چلتی جا رہی تھی۔ نسل انسانی کے مانند مختلف قد کاٹھ کے خیمے، سفید کارواں اور ٹورسٹ ویگنیں ——— چاروں طرف اِک شہرِ خوابیدہ تھا۔ ایک مقام پر تاریکی مزید گہری ہوئی تو چوکیدار عورت رُک گئی۔ "فی الحال خیمہ یہیں نصب کر لو، صبح ہو گی تو اپنی من مرضی سے جہاں جی چاہے شفٹ کر لینا۔"

"اور پاسپورٹ......" اُس کی آواز نے تاریکی میں گُم ہوتی چوکیدار کا پیچھا کیا۔

"صبح......" اندھیرے کے گھونگٹ میں سے آخری جواب آیا۔

ایک ناتجربہ کار کے لیے اتنے گاڑھے اندھیرے میں خیمہ نصب کرنا ایک بے سُود کوشش ہوتی۔ مگر اُس کے ہاتھوں کو معلوم تھا کہ خیمے کے کن سوراخوں میں اگر لوہے کا ڈنڈا پرو دیا جائے تو وہ ایک پھولے ہوئے بلاؤز کی طرح تن جاتا ہے۔ کون سی میخ کہاں گاڑی جانی ہے، ایک بوڑھے جلاد کی طرح جو گئی رات کسی مجرم کے پاؤں، ہتھیلیوں اور گردن میں میخیں ٹھونک کر اُسے مصلوب کرتا ہے اُس نے خیمے کو نصب کرنا شروع کر دیا۔ کوئی بھی عمل جب ٹرائل اینڈ ایرر کے مرحلے سے گزر کر ٹھوس تجربے کی صورت اختیار کر جاتا ہے تو پھر گاڑھے

اندھیرے میں بھی اُسے کمال خوش اسلوبی سے سرانجام دیا جا سکتا ہے خیمے کے عارضی گھر نے شکل اختیار کی تو اُس نے پردہ اُٹھایا "میرا گھر"

"تمھارا گھر کہاں ہے؟"

"فی الحال یہی ہے"

"نہیں فی الحال کی شرط ناواجب ہے، گھر کہاں ہے؟"

تم شاہ زمان! تمھارا گھر کہاں ہے؟ بریڈ فورڈ کا شہر جو صرف جغرافیائی لحاظ سے ولایت میں واقع ہے یا شاہدرے کی کچی آبادی جب وطن چھوڑا تھا تو تم ایک معصوم معمولی پڑھے لکھے اور قدرے بیوقوف سے نوجوان تھے، جو زیرِ زمین چلنے والی ریل گاڑی میں سوار لڑکیوں کے بھرے بھرے بلاؤز دروں میں گم ہوتی ہوئی لکیروں کو دیکھ کر ہی چہرہ سُرخ کر لیتا تھا، اور جواب تاریکی میں بھی اپنی میخ نشانے پر گاڑ سکتا تھا چاہے زمین سخت ہو یا کیچڑ آلود۔ لیکن ٹامک ٹوئیاں مارنے اور ٹھوس میخی تجربے کے درمیان دس برس کا عرصہ تھا تم صرف اِس لیے ولایت گئے تھے کہ وہاں مزدوری کر کے اپنے کچے کوٹھے کو اینٹوں کے چبارے میں بدل دو اور بوڑھی ماں کو سہارا دینے کے لیے ایک رکشا خرید لو۔ ان میں سے کوئی کام بھی نہ ہُوا اور دس برس بیت گئے۔ ماں نے آخری خط میں لکھا تھا "بیٹا اب تو واپس آ جاؤ۔ یونس کریانے والا اپنے اُدھار کا تقاضہ بھی نہیں کرتا بلکہ اپنی بیٹی کے لیے رشتے کا خواہشمند ہے۔ اب تمھیں نہانے کے لیے مسیت میں بھی نہیں جانا پڑے گا۔ ہم نے گھر میں کھوٹی کا نلکا لگوا لیا ہے" لیکن اس نلکے میں سے تو پانی نکلتا تھا، بیئر نہیں، اور تم تو ہر شام برٹینیا بار کی سٹرانگ بیئر کے چھ مگ انڈیلنے کے بعد کسی گوری طوائف کو بازو میں ڈال کر اپنے کمرے میں جانے کے عادی ہو چکے ہو۔ تمھارے لیے یہ عمل عیّاشی نہیں معمول بن چکا ہے۔ تم معمول کے مجبور ہو، واپس کہاں جاؤ گے؟ فیکٹری میں سالانہ چھٹیوں کے موقع پر اگر تم ہسپانیہ میں آ نکلے ہو تو مقصد تاریخی مقامات میں نہیں بدنی مقامات میں گم ہونا ہے اِدھر سویڈیکا ملتی ہے۔ سویڈش لڑکی جو ساحلی علاقوں میں صرف سن اینڈ سینڈ کی تلاش میں

نہیں آتی بلکہ ایک تیسرا "S" نظریۂ ضرورت کے تحت اس کے بدن پر حاوی ہوتا ہے اور وہ ہے سیکس۔ تم تو اندھیرے میں بھی خیمہ گاڑ لیتے ہو۔

بُو...... بُو ہے یا میری تھکاوٹوں کا پسینہ...... نہیں بُو تھی اور پھر رونے کی آوازیں... کیا سچ مچ کوئی رو رہا ہے، بین کر رہا ہے۔ نہیں بلّیاں میاؤں رہی تھیں غرّا رہی تھیں اِس بُو اور غرّاہٹ میں ایک اور حیوانی آواز شامل تھی جو دبے دبے اُن سے باتیں کر رہی تھی۔ روتی۔ بین کرتی بلّیاں...... میرے بدن پر اُن کے کھڑے ہوئے بالوں کی جھالر ایک پنکھیا کی صورت چل رہی ہے اور میرے ہر مُو سے، رُوم رُوم، لُوں لُوں سے وحشت پھُوٹ رہی ہے، بلّیوں کا ایک آرکسٹرا ہے جو کمانڈر پرفارمنس کے لیے ریہرسل کر رہا ہے۔ اور اُن کے درمیان وہی حیوانی آواز جو تھنوں سے اُبلتی ہے اور اس کا لاوا المحہ بھر کے لیے ان کپکپاتی غرّاہٹوں کو ٹھنڈا کر دیتا ہے...... بُو مچھلی کی تھی مگر اس میں سڑاند تھی۔ جیسے جنگلی سؤر کے گوشت کو فرائنگ پین میں ڈالا جائے تو یک دم بھبھکا اُٹھتا ہے۔ میری ناک اس بُو سے ناآشنا ہے مگر ہے یہ مچھلی کی۔ اتنی تیز کہ شاید میں سڑی ہوئی مچھلیوں کے ڈھیر پر سویا ہُوا ہوں۔

دو مرتبہ زمان نے اپنے خیمے کی زِپ کو ٹٹولا اپنے اطمینان کے لیے، مگر وہ کسی ٹھوس جسم پر کسی ہوئی زپ کی طرح مضبوط تھی۔ صبح کی خنکی جب خیمے کے کپڑے میں سے سرایت کر کے اس تک پہنچی تو یک دم نیند دبے پاؤں بدن کے بستر پر دراز ہو گئی۔

"اوہ میگی، اتنی دیر سے تلاش کر رہی ہوں ڈیئر لو۔ کہاں دفع ہو گئی تھیں؟"

"کسی اور خیمے میں نہ تھی لیزا سمندر میں تھی"

"سمندر میں؟ تمھاری بکینی تو میرے بیگ میں پڑی ہے بالکل سُوکھی......"

"اوہ لیزا ڈیئر، اتنے خوشگوار پانی میں صبح سویرے کچھ پہن کر نہایا جاتا ہے سٹوپڈ؟"

سٹوپڈ نے بھی جواب میں کچھ کہا اور جو زمان تک نہ پہنچ سکا۔

"ہیلڈا..... بچّوں کے لیے ناشتہ تیار کر دو، ورنہ وہ اپنی رنگین بالٹیاں اور گیند اُٹھا کر ساحل کی طرف بھاگ جائیں گے۔"

"سال بھر میں دو ہفتے کی چھٹیاں اور اُن میں بھی مجھے ایک غلام کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ میں کہتی تھی ناں اس مرتبہ کسی ہوٹل میں ٹھہریں کیمپنگ کی بجائے میں اگر کسی کانسنٹریشن کیمپ میں چلی جاتی تو شاید زیادہ آرام نصیب ہوتا..... ہونہہ ناشتہ....."

"اس امریکی فیملی کی طرف دیکھو جو اپنے کارواں کے سامنے سلاخوں پر گوشت بھون رہے ہیں..... کیا خیال ہے ماریا؟ اگر ہم قریب جا کر کھڑے ہو جائیں تو شاید آفر کر دیں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے..... حشیش تو ملتی نہیں یہاں..... ڈارلنگ مرا کو چلیں۔"

"فرٹز ڈیئر..... آج کہاں چلیں؟"

"آرام سے بیٹھے رہو..... میں بتا دوں گا جب موڈ بنا۔"

"بہت بہتر فرٹز..... میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ رات نیند کیسی آئی؟"

"بکواس بند کرو شواتن..... تم نے سونے دیا؟"

زمان دیر تک سوتا رہا تھا۔ اُس کے اُوپر خیمے کا ہلکا سبز کپڑا ہسپانیہ کی گرم دھوپ کی شعاعیں جذب کر رہا تھا اور نیم روشن تھا جیسے لیمپ شیڈ کا باہر کا حصّہ۔ باہر کیمپنگ کا شہر بیدار ہو چکا تھا اور یورپ کی مختلف زبانیں گھلتی ملتی فضا میں پھیل رہی تھیں، اُس تک پہنچ رہی تھیں خیمے میں کھڑے ہونے کو تو جگہ نہ تھی چنانچہ زمان نے کسی جاپانی پہلوان کی طرح لیٹے لیٹے ٹانگیں چلا کر کپڑے بدلے اور پردہ اُٹھا کر باہر آ گیا۔

اُس کا چہرہ اور نصف آستین میں سے نکلتے ہوئے بازو ایک بوڑھے سانپ کی سکڑتی اور سلوٹوں سے بھرپور کینچلی کی طرح کھُردرے اور بے جان تھے۔ جلد پر مُردہ مچھلی کے چانوں ایسے کھرنڈ اُبھرے ہوئے تھے۔ ایک مست الست سادھو کی طرح سر جھکائے وہ گود میں پڑے اخبار کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پھٹے ہوئے فلیٹ بوٹوں کے گرد بلیّوں کا ایک غول تھا۔ کچھ صبح کی دھوپ میں مزے لینے کے لیے اکڑتی ہوئیں اور بار بار مونچھوں

والے منہ کھول کر جماہیاں لیتی ہوئیں اور بیشتر بے حد کاہلی کے ساتھ اُس کی کرسی کے گرد گھومتی ہوئیں۔ وہ ایک غیر مرئی دائرے میں چل رہی تھیں جس کا مرکز وہ شخص تھا۔ بے جان کینچلی کے جسم والا بوڑھا۔ اُس کے عقب میں ایک بہت بڑا خیمہ تھا جیسے میدانِ جنگ میں یورپی نائٹس کے ہوا کرتے تھے مگر فقیر کی گدڑی کی طرح رنگ برنگے بوسیدہ پیوندوں سے چپکا ہُوا۔ پیوندوں کی وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک زمانے میں بوڑھے کے بدن کو بھی ڈھانپتے تھے۔ لگتا تھا کہ پیدائش سے لے کر اب تک کی اُترن سے اُس نے اپنا یہ گھر بنایا ہے۔ خیمے کے دونوں طرف ٹین کے بنے ہوئے متعدد بڑے بڑے ڈبے تھے جن پر مکھیوں کا ایک ٹڈی دَل منڈلا رہا تھا۔ وہ قطاروں کی صورت میں ڈبوں میں داخل ہو رہی تھیں جن کے نچلے حصّوں کے ساتھ ٹاٹ کے تھیلے مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ کچھ کچھ آٹا پیسنے والی چکّی کے نیچے بندھی بوریوں کی طرح۔ یہ تھیلے آہستہ آہستہ حرکت بھی کرتے تھے کہ مکھیوں کی منزل یہی تھی اور پھر وہ مخصوص بُو بھی کہیں آس پاس تھی سڑی ہوئی مچھلی کی بُو، کبھی کبھار کوئی بلّی اُلٹے پاؤں چلتی اپنی پُشت بوڑھے کے فلیٹ بوٹ جما دیتی تو وہ بڑی وحشت سے اُسے فٹ بال کی طرح ہوا میں اُچھال دیتا۔ بلّی زمین پر گرتے ہی اُسی سُستی کے ساتھ دھوپ سینکنے لگتی۔

زمان کو دیکھ کر بوڑھے نے سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں پر بھی شاید جھُرّیاں تھیں اور اُن کے گرد کوّے کے پنجوں ایسے سیاہ حلقے چھٹے ہوئے تھے۔ زمان کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے پھیلے تو بوڑھے نے سر جھکا لیا اور اخبار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ ایک بلّی اُس کے فلیٹ بوٹ پر بیٹھ گئی مگر اُسے اس نے ہوا میں نہیں اُچھالا، بیٹھا رہنے دیا۔

زمان کے چاروں اُور لاتعداد خیمے پھیلے ہوئے تھے، جڑواں بچوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست۔ صرف بوڑھے کا خیمہ ان سب سے الگ ایک ایسے ٹیلے پر ایستادہ تھا جہاں سے سمندر کا پورا وجود اُمڈا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ اِس ٹیلے پر اور کوئی خیمہ نہ تھا سوائے زمان کے جو ایک سہمے ہوئے کبوتر کی طرح اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ساحل کی جانب اُترا تو مختلف خیموں کے باہر بیٹھے ہوئے لوگ اُسے دیکھ کر حسبِ معمول ہاتھ ہلاتے، ہیلو

کہتے یا پھر ایک نگاہ ڈال کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ اور کام کیا تھے؟ کافی کی تیاری، نچڑتے ہوئے نہانے کے لباس سکھانا یا دھوپ سینکنا، یہاں میگی اور اس کی سہیلی کا خیمہ بھی تھا جو اُسے علی الصبح سمندر میں صرف پیدائشی لباس میں نہانے پر سرزنش کر چکی تھی۔ وہ جرمن خاندان بھی تھا جس کی خاتونِ خانہ پانچ بچوں کا ناشتہ بناتے بناتے نڈھال ہو رہی تھی۔ ہپی جوڑا ابھی تک امریکی نیلی کے قریب اس اُمید پر کھڑا تھا کہ انھیں وہاں سے کچھ کھانے کو مل جائے گا اور وہ جرمن نوجوان بھی جن میں سے ایک اپنے دوست کے سامنے اتنا دب کر، اتنا مؤدب ہو کر بات کرتا تھا جیسے وہ ابھی اُسے خلعت سے نوازنے کو ہے۔ ساحل پر حسبِ توقع بچے تھے ریت کے قلعے تعمیر کرتے ہوئے اور لڑکیاں تھیں اوندھی لیٹی ہوئی۔ بکینیوں کے بالائی حصّے کی گرہ کھولے ہوئے اور نچلے حصّے کو بچوں ایسی لکیر کے آغاز تک کھسکائے ہوئے۔ اور جوڑے تھے بیزاری کے اُس رشتے میں بندھے ہوئے جسے شادی کہتے ہیں، اِکّا دُکّا بوڑھے تھے اور علی کانت کا شہر تھا۔ پچھلی شب کا بھڑکتا ہُوا روشن علی کانت جو ساحل کے ساتھ ایک مُردہ وہیل مچھلی کی طرح پڑا ہُوا تھا۔

اور سمندر تھا...... ایک نیلا ریگستان جو بے آب و گیاہ اور خاموش تھا۔ بظاہر... مگر اس کے اندر...... سطح سے نیچے ...... اس کے بڑے پیٹ میں وہیل مچھلیاں چابی دار کھلونوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ شاید اُنھوں نے سطحِ آب پر آ کر سانس لینا چھوڑ دیا تھا کہ وہ خائف تھیں اس چھوٹی سی کشتی سے جس میں کھُردری اُنگلیوں والے ہاتھ نیزے تھامے اُن کے منتظر تھے۔ اُن کا خوف بے وجہ تھا۔ اس وقت سمندر پر کہیں بھی وہ کشتی نہ تھی...... مگر جانے کب نمودار ہو جائے۔

اور سمندر تھا...... اور سمندر کے اُوپر آسمان میں ایک جہازی سائز کی پتنگ معلق تھی جیسے وہاں چپک گئی ہو۔ البتہ اس کی طویل جھالردار دُم کسی جاپانی مُرغ کی دُم کی طرح فضا میں لہریئے سے لے رہی تھی۔ اُسے کون اُڑا رہا تھا؟ اس کی بلندی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈور زمین پر کھڑے کسی انسان کے ہاتھ میں تو نہ تھی۔ ساحل کے عین اُوپر

نگری فلیٹوں کی بلند عمارت پر شاید...... کاش اس کی ڈور ٹوٹ جائے، یہ بو ہو جائے اور میں اسے لُوٹ لُوں۔ بالفرضِ محال اگر ایسا بھی ہو جائے تو یہ خوبصورت پتنگ سمندر میں گرے گی اور سمندر پرخطر تھا۔ اس میں وہیل مچھلیاں تھیں۔ اُسے لُوٹنے کے لیے مجھے ایک چھوٹی سی کشتی درکار ہو گی...... اور ابھی شاید اس کا وقت نہ تھا۔

میرا بدن خون میں خون کی گردش اور خمار کی آسُودگی کے ترازو پر ہمیشہ سے جھولتا رہا تھا۔ یہ ہاتھ، یہ انگلیاں ایک کمہار کی طرح ہر قسم کی مٹّی کو ڈھالتے، اُس میں حدّت پیدا کر کے اُسے گیلی کرنے کے عمل سے آشنا نہ تھے، ماہر تھے۔ لذّت کے تمام عمل روٹین کے پہیئے پر بندھے ایک معمول ہو چکے تھے۔ مگر ایک ایسی لذّت بھی تھی کہ جس کے لیے خواہش ابھی باقی تھی...... بہت سے برس گزرے۔ بسنت کی شام کے دھندلکے میں، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیم تاریک آسمان پر اُن پتنگوں کے سائے ڈھونڈ رہا تھا جو شہر سے باہر کے باغوں پر کٹ کر آب ہیولوں کی طرح میرے اُوپر سے گزر رہی تھیں اور اُن کی ڈوریں میری پہنچ سے باہر کہیں فضا میں لٹکتی لٹکتی چلی جا رہی تھیں۔ میں اپنے کچے کوٹھے سے نیچے اُترنے کو تھا کہ ایک دم میرے کان پر جیسے ایک نامعلوم آری سی چل گئی ہو، جیسے شہد کی مکھی بھنبھنا رہی ہو، میں نے وحشت میں کان پر ہاتھ مارا تو وہ آری میری ننھی منھی اُنگلیوں کے درمیان چلنے لگی۔ میں نے فوراً مٹھی بھینچ لی۔ چند لمحوں کے لیے ڈور ایک مُردہ کینچوے کی طرح بے حرکت پڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے جیسے کسی لان میں پڑی ربڑ کی نالی میں پانی بھرتا ہے وہ تنتی گئی۔ پتنگ نہ جانے کتنی دُور تھی، کہاں تھی اور آسمان تاریک تھا۔ میری کمزور مٹھیاں تنی ہوئی ڈور کو اپنی تمام تر قوت سے تھامے ہوئے تھیں مگر وہ آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی اور اس پر اُبھرا ہُوا تیز مانجھا میری ہتھیلی پر ایک خون آلود راستہ بنا رہا تھا۔ زخموں کی اذیت کے باوجود میں اُسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور پھر آسمان کے اُس حصّے میں جہاں میری نادیدہ محبوبہ ہلکورے لے رہی تھی ہوا کا زور بڑھا اور ڈور میری ناتواں مٹھی میں سے اس تیزی سے نکلی کہ کچے کوٹھے کی کچی مٹّی پر گرمیوں کی دھوپوں کے باوجود کئی روز تک بھورے نشان دکھائی

دیتے رہے ...... میری آنکھوں میں آنسو تھے اور مٹھی خون آلود مگر بند۔ وہیل جب تاریک سمندر میں ڈبکی مار جاتی ہے تو ماہی گیروں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے سانس پر کھنچے ہوئے نیزے سے بندھی ڈور اُن کی ہتھیلیوں کو لہولہان کرتی پھسلتی جاتی ہے، وہ اُسے چھوڑتے نہیں، مگر میں نے اُسے چھوڑ دیا اور وہ وہیل میرے قبضۂ قدرت سے نکل کر آسمان کے تاریک سمندر میں کھو گئی۔ آج ...... اب میرے ہاتھ پہلے کی نسبت مضبوط تھے اور ہتھیلیاں توانا۔ وہ ڈور اگر میرے ہاتھ میں آجائے تو میں اُسے کبھی نہ چھوڑوں کہ وہیل تبھی موت سے ہمکنار ہوتی ہے اُس کے گرد سُرخ پھول تبھی کھلتا ہے اگر ڈور کو مضبوطی سے تھامے رکھا جائے ...... خون میں خون اور الکوحل کی گردش کے تجربوں سے اُکتائے ہوئے جسم کے لیے لذت کا آسمانی احساس آج بھی اُسی تنی ہوئی ڈور سے عبارت ہے جو بسنت کی شام میرے کانوں پر سرسرائی تھی ...... اور پھر بچپن میں ایک معصوم خواہش ہمیشہ میرے جسم پر رینگتی رہی ...... اگر میں ایک شہزادہ ہوتا تو اپنے تمام درباریوں، وزیروں سفیروں کو کہتا کہ وہ گلی کے پار اُس اونچے پکے کوٹھے پر کھڑے ہو کر بڑی بڑی پتنگیں اُڑائیں اور جب وہ آسمانوں سے ناک رگڑنے لگیں تو انھیں ہاتھوں سے چھوڑ دیں، ڈور کو خود توڑ دیں ...... اور میں اِدھر ...... اِس کچے کوٹھے پر کھڑا ان تمام پتنگوں کو لُوٹتا رہوں۔ صرف اُس تجربے سے لُطف اندوز ہونے کے لیے جب ڈور تمھارے اوپر آہستگی سے گرتی ہے اور تم اُسے جھپٹ کر تھام لیتے ہو اور پھر وہ دھیرے دھیرے تننے لگتی ہے ...... میں شہزادہ تو نہ بن سکا مگر دوسرے کوٹھے پر تمام وزیر، امیر، سفیر بڑی بڑی پتنگیں اُڑا رہے ہیں۔ میں اپنے کچے کوٹھے پر چیتھڑوں میں لپٹا ننگے پاؤں پچکے ہوئے پیٹ کو تھامے اُن پتنگوں کے کٹنے کا منتظر ہوں مگر وہ اُنھیں کبھی نہیں چھوڑتے میرے لیے، اُن کی ڈور مضبوط ہے اور وہ کبھی اِسے میرے لیے نہیں توڑیں گے۔ جب تک کہ میں ایک چھوٹی سی کشتی پر سوار اُن پتنگوں کے درمیان نہ چلا جاؤں اور اُنھیں اپنے بازوؤں سے توڑ کر لُوٹ نہ لوں ......

"گُنٹن مارگن"

زمان نے چونک کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ جرمن لڑکے ریت پر قدم جماتے آ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک وہ مخصوص جرمن تھا جو قدرے فربہ ہوتا ہے۔ تھرتھراتے ہوئے گال ہر وقت سُرخ رہتے ہیں اور بیئر ہالوں میں مخمور ہو کر میز پر چڑھ کر چیختے ہوئے "ڈوئش لینڈ اُوبر آلیس" گاتا ہے۔ دوسرا لڑکا اکڑ تن کر کھڑا ہو تو مشاقی سے کٹے ہوئے سُوٹ میں اُس کا بانکا جسم ایسے ہسپانوی کا تھا جس کی رگوں میں شاہی خون کی غیر قانونی آمیزش ہوتی ہے۔ مگر جب وہ دو قدم چلتا ہے تو اُس کے لچکتے ہوئے کولہوں اور بازوؤں کے نسوانی تحرک کو دیکھ کر طبیعت متلانے لگتی ہے۔ زمان کو صبح بخیلی آزردہ بیئر ہال والے جرمن نے کی تھی جو ایک بے دام غلام کی طرح دوسرے کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

ہسپانوی سمندر نتھنوں میں ایک عجیب سنسناتی باس پھیلا دیتا ہے ...... ہا۔ ہا" موٹا جرمن نتھنے پھیلا کر ہا۔ ہا۔ ہا کرتا گہرے سانس لینے لگا۔

اُس کے بانکے ساتھی نے کندھے اچکائے اور باریک ہونٹوں کو بھینچ کر اِس عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا ...... سمندر۔ تازہ ہوا ...... اور ...... اور ......"

"اور کیا گنتھر؟" بانکا جرمن اپنے ہونٹوں میں سے جیسے تھوکتا ہوا بولا۔

"اور تم فرٹز ...... اور تم" موٹے جرمن نے اتنے پالتو پیار سے کہا کہ اگر زمان وہاں نہ ہوتا تو شاید وہ اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتا۔

"آپ پچھلی شب بہت دیر سے کیمپنگ میں آئے" فرٹز یک دم زمان سے مخاطب ہو کر بولا"

"جی"

"تبھی" فرٹز کے بھینچے ہوئے ہونٹ سفاکانہ انداز میں پھیل گئے۔

"تبھی کیا؟"

"تبھی آپ بادشاہ کے ہمسائے میں ہیں ...... بہرحال اندھیرے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے"

"ہاں اندھیرے میں......" گنتھر خوش ہو کر چہکا۔

"بکواس نہیں کرو شوائن" فرٹز کی آواز ایک سستی سیٹی کی طرح چیخی۔ سطحی اور سماعت کو رگڑتی ہوئی۔

"سوری فرٹز......" گنتھر نے ایک پشیمان کتے کی طرح سر جھکایا اور پھر فوراً ہی ہاہا کرتا نتھنے پھلا کر سمندر کی ہوا کو اپنے اندر کھینچنے لگا۔

"لیکن میرے خیمے کے سامنے ایک بوڑھا ہے......لاتعداد بلیوں والا بوڑھا۔"

فرٹز نے ایک تمسخر سے لتھڑی ہوئی مسکان کے ساتھ زمان کو حقارت سے دیکھا۔

"تم جب رائلٹی کو دیکھتے ہو تو تمھیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ تم رائلٹی کو دیکھ رہے ہو۔" وہ ایک غلیظ سے قہقہے کو چباتے ہوئے بولا" وہ رائلٹی ہے براؤن مین۔ وہ بلیوں والا بوڑھا نہیں بادشاہ ہے تم نے اس کے خیمے پر لہراتے ہوئے جھنڈے کو غور سے نہیں دیکھا......کِنگ آف سکاٹ لینڈ...... یقین نہیں کرتے تو خود جا کر پوچھ لو......"

"اور صرف بلیاں نہیں......" فرٹز کو خوش کرنے کی غرض سے گنتھر مسکین صورت بنا کر پوپلے منہ کہنے لگا" بلیاں، مکھیاں، مچھلیاں......رات کو اُن کے غرّانے کی آواز نہیں آتی؟ مچھلیوں کی سڑاند سے آشنا نہیں ہوئے؟ مکھیوں کی بھنبھناہٹ تمھارے کانوں میں نہیں سرکتی رہی؟......یہ آوازیں اور بُو بادشاہ کی سلطنت کا قومی ترانہ ہے......گاڈ سیو دی کنگ......ہا......ہا......ہا......" اُسے پھر سمندر کا خیال آ گیا اور نتھنے پھلا کر گہرے سانس لینے لگا۔ ہوا خوری سے پیٹ بھر کر وہ زمان سے ایسے سوال پوچھنے لگا جو کیمپنگ میں آنے والے ہر نو وارد سے پوچھے جاتے ہیں۔ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کتنے روز قیام کرو گے؟ اور پھر تینوں کیمپنگ کی جانب چلنے لگے۔ فرٹز لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور گنتھر اُس کے پہلو میں اچک اچک کر برابر ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور ہانپتے ہوئے زمان سے گفتگو بھی کرتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے خیمے کے قریب پہنچ کر انھوں نے "انیداذین"

کہا اور پیچھے سے اندر گھس گئے۔

اپنے پیوند خوردہ خیمے کے سامنے بلیوں والا بوڑھا، بلیوں میں گھرا حسب سابق اخبار پڑھ رہا تھا۔ فرٹز نے درست کہا تھا۔ خیمے کے بانس پر ایک جھنڈا نما چیتھڑا پھڑ پھڑا رہا تھا اور اُس پر "کنگ آف سکاٹ لینڈ" کے الفاظ لکھے تھے۔

"بادشاہ کی ہمسائیگی میرے بس کی بات نہیں۔" زمان نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے سوچا" میں تو علی کانت میں اچھا وقت گذارنے کی خاطر آیا ہوں۔ اور اگر آپ ایک عدد "اچھا وقت" اپنے خیمے میں لا رہے ہیں اور وہاں یہ بوڑھا اور اُس کی بلیاں چوکیداروں کی طرح براجمان ہوں تو ایسے حیوانی ماحول سے دہشت زدہ ہو کر "اچھا وقت" تو پاس بھی نہیں پھٹکنے دے گا۔ ساحل کے قریب خیمہ لگایا جائے۔"

زمان نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور خیمے کو اُکھاڑنے کی نیت سے باہر آ گیا۔ پہلے میخوں کی باری تھی جو پچھلی شب عجلت کے سبب زمین میں پوری گہرائی تک نہیں اُتری تھیں۔ وہ اُن کی گردنیں پکڑ کر خود رو کھمبوں کی طرح مزے سے اُکھاڑنے لگا۔

"ہیلو لیڈی......"

زمان کی چٹکی ابھی پانچویں میخ کے گرد بھینچ رہی تھی کہ بوڑھے کی آواز آئی۔

"ہیلو" چٹکی میخ پر جمی رہی مگر اس نے بوڑھے کی جانب دیکھا نہیں۔

"میں نے کہا ہیلو لیڈی" وہ پھر بولا۔

زمان نے اُس کی طرف ایک سپاٹ چہرے سے دیکھا۔ بوڑھے کے سفید دانت اُس کے پپڑی جمے ہونٹوں سے باہر آ کر چمکنے لگے۔ پھر اُس نے ایک دم ہونٹ بھینچے اور فوراً ہی کھول دیئے۔ مگر اس مرتبہ اُوپر والی قطار میں سے اُس کے تین دانت غائب ہو چکے تھے۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"پاکستان کا ہوں۔"

"وہاں مکھیاں ہوتی ہیں؟"

"ہاں بہت ہوتی ہیں"

"تو پھر مجھے اُن کے بارے میں بتاؤ...... آؤ۔"

زمان آخری میخ کو ہتھیلی پر رکھ کر اُسے کچھ دیر تک گھماتا رہا اور پھر بوڑھے کے پاس چلا گیا۔ ایک بلی نے فوراً اُس کے پاؤں کو سونگھا اور پھر دُم اُٹھا کر دھوپ میں انگڑائیاں لینے لگی۔ بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر ہونٹ بھینچنے کا عمل دُہرایا اور اُس کے گم شدہ نقلی دانت بتیسی میں واپس آ چکے تھے۔

"اُن جرمن سؤروں کے خوفزدہ کرنے پر خیمہ اُکھاڑ رہے ہو" وہ انتہائی غصے سے بولا "گندی مچھلیاں دونوں...... ہونہہ...... تمھیں یہاں پر ہسپانیہ کے دوسرے علاقوں کی نسبت مکھیاں کم نظر نہیں آئیں؟"

"میں نے غور نہیں کیا......" زمان قدرے بوکھلا کر بولا۔

"غور کرو...... اپنا ہاتھ ہوا میں لہراؤ، کیا کوئی مکھی اُس کے راستے میں حائل ہوتی ہے؟ ایک ٹافی کو منہ میں چبا کر اپنے خیمے کے سامنے رکھ دو پھر تمھیں پتہ چلے گا۔"

"ہاں شاید کم ہی ہیں۔" زمان نے اُس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔

"اور اِس کا ذمہ دار میں ہوں......" بوڑھے نے رعونت سے اعلان کیا۔

زمان کچھ زیادہ ہی بوکھلا گیا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا اور پھر سر ہلا کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں۔ اس کا ذمہ دار صرف میں ہوں...... پانچ برس پہلے جب میں اس ساحلی شہر میں آیا تھا یہاں کی ہوا میں کسی اور پرندے کے لیے اُڑنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ مکھیاں ٹڈی دل کی طرح چھائی ہوئی تھیں...... اُن دنوں میں سانگر یا سُپر سٹور کے گوشت کے کاؤنٹر پر گیا تو وہاں پانچ میٹر x تین میٹر کے رقبے میں پڑے گوشت کے ٹکڑوں پر پوری ایک سو سینتیس مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں میں نے خود گنیں......

اور اب...... تم یقین نہیں کرو گے......" وہ پُراشتیاق لہجے میں بولا اور پھر اپنے مصنوعی دانت عُریان کے سرے سے علیحدہ کر کے انھیں کہیں حلق میں روپوش کرتے ہوئے خاموش ہو گیا...... زمان کی خاموشی پر وہ جھلا کر کہنے لگا "میں کہہ رہا ہوں تم یقین نہیں کرو گے......"

"کس بات پر؟" زمان نے بھی جھلا کر پوچھا۔

"یہی کہ پچھلے ہفتے میں سانگر یا سُپر سٹور میں گیا اور اُسی گوشت کے کاؤنٹر پر پانچ میٹر x تین میٹر کے رقبے میں بیٹھی ہوئی مکھیوں کو شمار کیا...... صرف چوبیس...... اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔"

"یعنی آپ مکھیاں مارتے ہیں؟"

"میں اُنھیں مارتا نہیں۔ صرف ٹریپ کرتا ہوں اور وہ خود ہی مر جاتی ہیں۔"

"دلچسپ مشغلہ ہے۔"

"مشغلہ؟" وہ بھڑک اُٹھا "یہ میری زندگی کا نصب العین ہے۔ ایک ایسا نظام قائم کرنا جو مکھیوں سے پاک ہو۔ مجھے مکھیوں سے شدید نفرت ہے۔ یہ گندگی پھیلاتی ہیں۔ نیچ ذات کی یہ مخلوق اگر ایکا کر کے متحد ہو جائے تو شریف آدمیوں کا جینا دوبھر کر دیتی ہے۔ دوسرے جانوروں کی طرح رہائش ان کا مسئلہ نہیں۔ یہ صرف خوراک کی متلاشی ہوتی ہیں۔ صرف پیٹ بھرنا چاہتی ہیں۔ دنیا میں ہر بُرائی کی جڑ مکھی ہے۔ اِسے ختم کر دو تو ہر طرف امن اور آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔ دُنیا ستھری ہو جائے...... کارخانے چلیں۔ دولت کی ریل پیل ہو۔ جنگ کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ سیاست دان ایسی خوراک کھا لیتے ہیں جس پر مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں اور پھر اُن کے معدے بگڑ جاتے ہیں اور وہ نروس ہو کر جنگ چھیڑ دیتے ہیں۔ اور یہ جو حادثے ہوتے ہیں سڑکوں پر۔ ڈرائیور آرام سے کار چلا رہا ہے، سامنے سے ایک اور کار آتی ہے اور ریبنگ...... دونوں ڈرائیور قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم اپنی اپنی سائڈ پر معینہ رفتار کے اندر کار چلا رہے تھے۔ پھر حادثہ کیسے ہو گیا؟......

بہت آسان جواب ہے۔ ایک ڈرائیور کی آنکھوں کے سامنے سے ایک سیکنڈ کے لیے ایک عدد مکھی پرواز کر جاتی ہے۔ ظاہر ہے اُس ایک سیکنڈ کے لیے ڈرائیور دیکھ نہیں سکتا اندھا ہو جاتا ہے اور بینگ...... اور یہ جو آئے دن دہشت پسند ہوائی جہاز اغوا کرتے ہیں۔ وُہ بھی صرف مکھیوں کی وجہ سے...... اور یہ ہڑتالیں اور مظاہرے...... مکھیوں سے پاک نظام قائم کرنے کے لیے میرے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو خالی پیٹ رہ کر بھی اپنے ایمان کی قوت سے اس آدرش کی تکمیل کر سکتا ہو۔"

پاگل پن اور کسی بھی عقیدے پر اندھا دھند یقین رکھنے کے درمیان ایک باریک سی لکیر ہے۔ زمان کے سامنے ہانپتا ہُوا ایک ایسا انسان تھا جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اِس لکیر کے اِدھر ہے یا اُدھر جا چکا ہے۔

"دُنیا میں اور لوگ بھی میری طرح مکھیوں سے نفرت کرتے ہیں، اُن کا قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں......" بوڑھے کے ہونٹ پھر لرزنے لگے"...... مگر ان کے پاس مناسب طریقۂ قتل نہیں ہے اور میرے پاس ہے...... ایک انتہائی منظم اور ناکام نہ ہونے والا سو فیصد طریقۂ قتل...... میں نے ایک ایسی مشین بنائی ہے جو ایک گھنٹے میں پانچ سو مکھیاں قتل کرتی ہے...... یہ اوسط شرح موت ہے۔ کبھی کبھار پانچ سو تیس تک بھی مر جاتی ہیں...... میرے ساتھ آؤ۔" وہ اخبار سمیٹ کر اپنے آپ کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں بھی ٹیڑھی تھیں۔ بندر یکٹوں کی طرح۔ وہ اُنھیں حرکت میں لا کر ٹین کے اُن ڈبوں کی طرف گیا جو اُس کے خیمے کے پہلو میں نصب تھے۔ مکھیاں پاگلوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ ان کی بھنبھناہٹ کی گونج سے زمان کے کانوں کے پردے لرزنے لگے۔ بوڑھے نے ایک ڈبے پر ہاتھ مارا اور فخر سے کہنے لگا "ایک گھنٹے میں پانچ سو مکھیاں...... اور طریقۂ کار بے حد آسان...... مچھلی مارکیٹ سے پانچ کیلو مچھلی خرید لو، ان کے سر علیحدہ کر کے ان ڈبوں میں ڈال دو۔ مچھلی کے سروں میں سے ایک ایسی بُو نکلتی ہے جو ان مکھیوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ چاروں طرف سے منڈلاتی ہوئی اِس بُو کی جانب آتی ہیں۔ اس کا

تعاقب کرتی ہوئی ڈبے کے اندر داخل ہو جاتی ہیں۔ مگر اندر جاتے ہی وہ ٹریپ ہو جاتی ہیں کیونکہ اب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ آہستہ آہستہ یہ بُو ان کے دماغ پر اثر انداز ہونے لگتی ہے اور وہ نیم مدہوش ہو کر ڈبوں کے نیچے بندھے تھیلوں میں گر جاتی ہیں......"

"یعنی اس مشین کو چلانے کے لیے صرف مچھلیوں کے سر درکار ہیں؟"

"ہاں......" اُس نے مسرت کے اظہار کے طور پر اپنے تین نقلی دانت پھر سے غائب کر دیئے۔ "یہی تو ٹریپ ہے...... عام مچھلیاں نہیں مائی ڈیئر۔ ایک مخصوص نسل کی چھوٹے سروں والی مچھلی جس کے بارے میں اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے سر میں سے ایک ایسی بُو نکلتی ہے جو مکھیوں کو مست کر دیتی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں۔ مچھلی مارکیٹ میں پڑے ڈھیروں میں سے میں خود انھیں پہچانتا ہوں اور ایک ایک مچھلی چُنتا ہوں۔ یہی تو ٹریپ ہے۔"

مکھیوں کے یہ ٹریپ واقعی انتہائی ہنرمندی سے بنائے گئے تھے۔ ہر ٹریپ پر مکھیوں کے غول بھنبھنا رہے تھے۔ بوئے فنا انھیں اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ زمان نے دیکھا کہ یہ یک طرفہ ٹریفک ہے۔ جو مکھی ایک مرتبہ نیچے چلی گئی سو چلی گئی۔ ڈبوں کے نیچے بندھے تھیلے بھاری ہو رہے تھے۔ بوڑھا ہر تھیلے کو ٹٹولتا اور اس میں ذخیرہ شدہ انبار پر اظہارِ اطمینان کرتا۔ بلیاں حسبِ سابق اس کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں۔

"جب یہ تھیلے بھر جاتے ہیں تو میں اُنھیں اُتارتا ہوں اور سمندر میں جا کر ڈبو دیتا ہوں۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ انھیں ان بلیوں کو کھلا دیتے ہیں۔" زمان نے کچھ کہنے کے لیے کہہ دیا۔

"یہ بلیاں......" وُہ ایک نرم پُسّی کو ٹھوکر مار کر بولا "یہ لالچی درندے میرا ساتھ صرف اس لیے دیتے ہیں کہ میں انھیں خوراک مہیا کرتا ہوں۔ مچھلیوں کے سر تو مکھیوں کو ٹریپ کرنے کے کام آتے ہیں۔ باقی تقریباً چار کیلو گوشت بچ جاتا ہے۔ ایک کیلو میں کھا جاتا ہوں اور بقیہ ان بدذاتوں کو کھلا دیتا ہوں۔ اِنھیں خوراک کا لالچ نہ ہو تو کبھی میرا ساتھ نہ دیں۔"

"تو کیا آپ کے یہاں آنے سے پیشتر ساری بلّیاں بھوکوں مرتی تھیں؟" زمان نے پھر ہانکی۔

"یہی تو ٹریپ ہے......" وہ پھر اپنی بے دانت مسکراہٹ نمایاں کر کے بولا "میرے یہاں آنے سے پہلے یہ ماری ماری پھرتی تھیں۔ خوراک کے لیے جد و جہد کرتی تھیں، مگر اب یہ نکمّی ہو گئی ہیں، سست ہو چکی ہیں۔ یہ بھول چکی ہیں کہ اپنے پنجوں سے کوڑا کرکٹ بکھیر کر اُس میں سے خوراک کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اب ان کی زندگی کا انحصار صرف مجھ پر ہے لیکن میں اُنھیں یُونہی کھانے کو نہیں دے دیتا۔ میز پر مچھلیوں کے ڈھیر رکھ دیتا ہوں اور یہ بھوک سے مجبور اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ مگر میں انھیں کھانے نہیں دیتا۔ اُنھیں بھوکا رکھتا ہوں ایک خاص وقت تک۔ ایک ایسے لمحے تک جب اگر میں خوراک نہ دوں تو یہ مجھ پر حملہ آور ہو جائیں۔ جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟" زمان نے فوراً تعمیل کی۔

"اِس لیے کہ میرے بدن میں بھی اب مچھلی کی بُو ہے۔ میں خود ایک مچھلی ہوں ذرا سونگھو۔" اس نے زمان کی ناک کے آگے اپنا کینچلی دار بازو کر دیا۔ ہاں اُس میں بُو تھی مچھلی کی۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں انھیں ایک آخری لمحے تک بھوکا رکھتا ہوں کہ اُس وقت اگر انھیں کھانے کو نہ ملے تو یہ مجھے۔ میرے جسم کو نوچ ڈالیں اور اُس آخری لمحے کی پہچان بھی صرف مجھی کو ہے۔ اُس وقت اِن کے نکوسے ہوئے دانتوں پر حیوانی جذبے پوری شدت سے چمک اُٹھتے ہیں۔ اِن کی غراہٹ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں پوری کھُل جاتی ہیں اور پھر ایک بِلّی آگے بڑھ کر میرے بوٹ پر دانت گاڑ دیتی ہے تب میں ان کے درمیان مچھلیوں کے ڈھیر پھینک دیتا ہوں۔" بوڑھے نے نفرت سے اپنے بازوؤں پر کھُجلی کی اور اُس کی جھلّی اُترنے لگی۔ جھلّی کے نیچے بھی مچھلی کے چانوں کی طرح کے کھرنڈ جمے ہوئے تھے۔

"کیا یہ خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا، اگر آپ اُس آخری لمحے کی پہچان نہ کر پائیں؟ چند سیکنڈوں کی دیر کر دیں تو؟"

"یہی تو ٹریپ ہے۔" وحشی اطمینان اُس کے چہرے سے پھُوٹتا "یہی تو خوبصورتی ہے۔ موت کی ٹھنڈی سانسیں اِن کی غراہٹ میں سے نکلتی محسوس کرنا اور پھر ان سانسوں کے سرد تر ہونے سے پہلے ہی خالی پیٹ کے لیے ایندھن مہیا کر دینا۔ یہی تو ٹریپ ہے۔" اس نے ایک تھیلے کو خاصی دیر تک ٹٹولنے کے بعد اُس کا منہ ایک رسّی کے ٹکڑے سے گھونٹا اور گھسیٹتا ہوا زمان کے قریب لے آیا۔ "بالکل بھرا ہوا ہے۔ میں انھیں سمندر میں ڈبو کر ابھی آتا ہوں......"

وُہ اور اس کا تھیلا اور اُس کی بلّیاں ریت پر گھسٹنے لگے۔

زمان واپس اپنے خیمے کے قریب آیا اور مٹھی میں پسینے سے بھیگتی ہوئی میخ کو اُس کی اصلی جگہ پر پھر سے ٹھونک دیا۔

خوشبو کیا ہے اور بدبُو کسے کہتے ہیں پہلے صرف بُو ہوتی ہے، اس کے ساتھ خوشی اور بدی کا اضافہ ہماری حسیّات کرتی ہیں۔ ذہنی رویّے کرتے ہیں۔ شراب کی بُو ایک بدبُو ہے، بدی سے بچنے والوں کے لیے اور خوشبو ہے، خوشی کی چاہت میں گرفتار رِندان کے لیے۔ نسل پرور پانیوں کی بُو ٹھنڈے جسموں کے لیے بدبُو ہے اور اُنہی جسموں میں حدّت بیدار ہو جائے تو وہی خوشبو کہلاتی ہے کڑوے تیل کا تڑکا بدبُو ہے اُن کے لیے جن کے پیٹ بھرے ہوں اور خوشبو جن کے تن بدن میں بھوک کے بُلڈوزر چلتے ہیں...... مچھلی کے مُنہ میں سے نکلنے والی بُو اِن کھیوں کے لیے کیا ہے؟

دوسری صبح جب اُس کی آنکھ پوری طرح کھُلی تو ایک بوڑھا سر خیمے کے پردے میں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ مینٹل پیس پر سجا ہُوا ایک حنوط شدہ جانور کا سر۔ یا جیسے سیاہ چادر میں سے جھانکتا کسی چڑیل بڑھیا کا چہرہ۔ مگر وہ مسکرا رہا تھا اپنے تین نقلی دانتوں سمیت۔ زمان کو جھرجھری سی آ گئی۔

"تم اپنے ملک کے صدر کو ذاتی طور پر جانتے ہو؟"

اگر کوئی اور شخص یوں اُس کے خیمے میں تاک جھانک کرتا تو وہ یقیناً غصے سے پھٹ پڑتا مگر زمان بوڑھے سے قدرے خوفزدہ تھا۔ بوڑھے سے اور اُس کی بلیوں سے۔

"ہمارے سیاسی نظام میں صدر نہیں ہوتا" زمان اُسے ٹالنے کے انداز میں بڑبڑایا۔

"پھر وزیراعظم ہوتا ہوگا، تم اپنے ملک کے......"

"ہمارے ہاں وزیراعظم بھی نہیں ہوتا"

"پھر کیا ہوتا ہے؟"

"ایک تیسری جنس......"

"خیر جو کچھ بھی ہوتا ہے، تم اسے ذاتی طور پر جانتے ہو؟"

"یار ہے اپنا......" زمان نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے بے بس ہو کر کہا۔

"یہی تو ٹریپ ہے......" وہ سر جھٹک کر خیمے کے اندر آنے کو تھا کہ زمان اُٹھ بیٹھا "دیکھیں مسٹر......"

"مسٹر نہیں...... کِنگ...... تم مجھے اِسی لقب سے پکار سکتے ہو"

"کِنگ؟"

"ہاں...... کِنگ آف سکاٹ لینڈ......" آنکھوں کے گرد حلقے سیاہ تر ہو گئے کہ وہ گہری متانت سے زمان کو یہ معلومات فراہم کر رہا تھا "کبھی میرے بڑے بوڑھے سکاٹش ہائی لینڈز پر حکمران تھے، اپنے بیگ پائپس سمیت۔ میرے خیمے میں پورا شجرۂ نسب موجود ہے لیڈی...... جونہی جمہوریت اور عوام کا یہ ممبو جمبو ختم ہوا وہ لوگ مجھے لے جائیں گے اور سکاٹ لینڈ کا شاہی تخت جھاڑ پونچھ کر میرے حوالے کر دیں گے...... ہے لیڈی تم اس بات پر بے حد مغرور نہیں ہو گے کہ تم ایک بادشاہ کو ذاتی طور پر جانتے ہو...... ہیں؟" وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "اور ہاں تم شاید کچھ کہنے والے تھے"

"میں یہ کہنے والا تھا کِنگ کہ میں پچھلے دس برسوں سے بریڈ فورڈ کی ایک فیکٹری

میں کھڑکیوں کے سیاہ پڑتے شیشوں کو صابن سے دھونے پر لگا ہوا ہوں۔ اس دوران کبھی ملک واپس نہیں گیا۔ میں کیسے......"

کِنگ کا سر فی الفور خیمے کے پردے سے باہر چلا گیا مگر فوراً ہی پھر نمودار ہو گیا۔

"تم اپنے ملک کے سربراہ کو ذاتی طور پر نہیں جانتے ناں؟"

"نہیں"

"تو پھر میرے پاس ایک ایسا نسخہ ہے کہ تم جان سکتے ہو"

"وہ کیسے؟"

"باہر آؤ پھر بتاؤں گا"

زمان کو یقین تھا کہ باہر آنے پر اُس کے جبڑے ایک ایسے باکسر کی طرح گالوں میں سے اُبھرے ہوئے ہوں گے جو مُکّے کی شدت سے بچنے کے لیے منہ میں چیونگم کا گولا رکھتا ہے مگر ایسی بے ہنگم صورت حال میں وہ باہر نہ آتا تو اور کیا کرتا۔

کسی سانولی کے گیلے لبوں کی طرح سمندر سے آنے والی ہوا میں نمکین نمی تھی۔

کِنگ کے ہمراہ بلیوں کا لشکر بھی تھا جو اُس کے خیمے کی جانب رُخ کرتے ہی اباؤٹ ٹرن ہو کر اُس کے پیچھے پیچھے مارچ کرنے لگا۔ کِنگ اطمینان سے اپنی کرسی کے پاس گیا اور اُس کی پشت پر شاہانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر اپنے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔ پھر فی الفور اُس کے اگلے تین دانت منہ میں غائب ہو گئے۔ البتہ وہ انہیں زبان سے اِدھر اُدھر گھماتا رہا اور ان کے اصلی دانتوں سے ٹکرانے کی ٹھک ٹھک سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔

"تمہارے ملک میں مکھیاں بہت زیادہ ہیں ناں؟"

"ہاں بہت زیادہ۔"

"یہی تو ٹریپ ہے" ٹریپ لفظ کی ادائیگی پر اُس نے اپنے منہ میں پھرتے آوارہ دانت کھٹاک سے بتیسی میں فٹ کر لیے "تم فوراً اپنے ملک واپس جاؤ اور وہاں کے سربراہ مملکت سے کہو کہ تمہارے ایک دوست...... یعنی میرے پاس

ایک ایسا نسخہ ہے جس کے استعمال سے پورے پاکستان میں مکھیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور یوں وہاں ایک صاف ستھرا مکھیوں سے پاک نظام قائم ہو جائے گا...... وہ یقیناً اس پیشکش سے فائدہ اُٹھانا چاہے گا اور یوں تم اس کے بھی دوست بن جاؤ گے۔"

"بہت بہتر" زمان نے ایک بلی کو جو خاصی دیر سے اُس کے ننگے پاؤں چاٹ رہی تھی ایک ٹھڈا رسید کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

"تو پھر کب جا رہے ہو؟"

"چلا جاؤں گا دو چار روز میں۔"

"ہے لیڈی......" زمان اپنے خیمے میں جانے کو مڑا تو کنگ نے صدا دی۔
"تم نے پوری بات تو سُنی ہی نہیں۔"

"یور میجسٹی......" زمان نے جعلی تعظیم سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

"مکھیاں مفت میں تو ختم نہیں کروں گا......" کنگ اترا کر بولا "میری فیس ہو گی...... صرف دس لاکھ ڈالر...... زیادہ ہے؟"

"نہیں بہت مناسب ہے......" وہ چاٹنے والی بلی اب زمان کی جبین کو چبانے کی کوشش کر رہی تھی "یہ آپ کی بلی......"

"بلی؟" کنگ ہنس دیا "بلا ہے...... ٹام کیٹ...... شی کیٹ نہیں ہے...... بلیوں کی جنسی زندگی کے بارے میں جانتے ہو۔ نہایت دلچسپ......"

جنس کا حوالہ سن کر زمان بے حد فرسٹریٹ ہوا اور فوراً اپنے خیمے میں چلا گیا۔

"ہیلو لیڈی......" بوڑھے کا سر پھر خیمے کے اندر جھانک رہا تھا۔

زمان کا پارہ چڑھ گیا "اگر آپ بُرا نہ مانیں کنگ تو...... میں...... اس وقت...... آرام...... کرنا...... چاہتا ہوں۔"

"دراصل میں سوچ رہا تھا کہ تم میرے دوست ہو" کنگ نے زمان کے اُبلتے ہوئے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اور میں اپنے دوست کے لیے ہر قربانی دے سکتا ہوں...... پانچ لاکھ۔"

"کیا پانچ لاکھ؟"

"میں صرف تمہاری وجہ سے تمہارے ملک کی مکھیوں کو قتل کرنے کے لیے اپنی فیس نصف کرنے کو تیار ہوں..... صرف پانچ لاکھ ڈالر چارج کروں گا، ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب تو خوش ہو ناں۔"

"ہا۔ہا۔ہا۔" زمان نے ایک پتلی کی طرح "ہا ہا" کیا مگر کنگ اس بناوٹی قہقہے کے خاتمے سے پیشتر ہی غائب ہو گیا۔

"میرا خیال ہے پاکستان ایک غریب ملک ہے۔" وہ پھر آ گیا۔

"ہاں ہے" زمان نے دانت پیستے ہوئے سر جھٹکا۔

"پھر تو زیادتی ہے۔"

"کیا زیادتی ہے؟" زمان تقریباً پھٹ پڑا۔

"یہی پانچ لاکھ ڈالر......" بوڑھا بالکل سرد لہجے میں کہنے لگا "میں اتنا سنگدل نہیں ہوں کہ ایک غریب، پسماندہ، مکھیوں سے بھرے ہوئے ملک سے پانچ لاکھ کی رقم چارج کروں...... میرا دل روتا ہے اِن کالے ایشیائی ملکوں کے لیے...... صرف ایک لاکھ ڈالر...... اور یہ فائنل ہے...... فائنل! سمجھے؟" اور چھپکے سے سر نکال کر غائب ہو گیا۔

شام تک اس کا دل زمان کے غریب ملک کے لیے اتنا رویا، اتنا رویا کہ فیس گھٹتے گھٹتے پانچ ہزار ڈالر رہ گئی۔

سومنگ کاسٹیوم کے سخت الاسٹک بینڈ اور بدن کے درمیان اُنگلی چلا کر اُس نے آہستہ آہستہ الاسٹک کے کھُبے ہوئے دانتوں کو گوشت سے علیحدہ کیا اور اس عمل سے سکون محسوس کرتے ہوئے ریت پر اوندھا لیٹ گیا۔ کاسٹیوم نیا تھا اور اُس کا سخت الاسٹک پانچ دس منٹ کے بعد بدن کو چیونگم کی طرح چبانے

لگتا تھا کبھی بدن پر سورج کی تمازت غالب آجاتی اور دوپہر کی فصل اُگ کر سوئیاں سی چبھونے لگتی اور دوسرے لمحے سمندر کی نیم خنک ہوا سے کپکپی طاری ہو جاتی۔ وہ آنکھیں موندھے لیٹا رہا اور لمحہ بہ لمحہ حرارتی درجوں کی کیفیات اُس پر وارد ہوتی رہیں۔ سمندر کا اطمینان اُس دبی دبی سرسراہٹ سے عیاں تھا جو لہروں کے ریت پر پھیلنے اور پیچھے ہٹنے سے وجود میں آرہی تھی۔ سمندر سے آنے والی ہوا نے یک دم سانس روک لیا اور اُس کی پشت پر چمٹے ریت کے ذرّوں نے حدّت کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی صورت میں اُسے بے آرام کر دیا۔ وہ سُستی کے خمار میں اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا پانی کی حدوں میں داخل ہو گیا۔ پہلے ریت نے اُس کے گرم تلووں کو چوسا اور پھر چند قدم چلنے کے بعد پاؤں میں کورل کے نوکیلے پتھر چبھنے لگے۔ پانی کمر تک آیا تو اُس نے اپنے آپ کو زمین کی گرفت سے چھڑا کر سمندر کے سینے پر لٹا دیا۔ کرنوں کا لشکتا ہوا جال تاحدِّ نظر سمندر پر بچھا ہوا تھا۔ اب وہ کہاں جائیں گی؟ سمندر پر جال ہے۔ اس کے سوراخ بس اتنے بڑے ہیں کہ ان میں سے چھوٹی مچھلیاں اور حقیر مخلوق تو بآسانی نکل جائے گی مگر وہیل مچھلیاں؟ اب وہ کہاں جائیں گی؟ اُنھیں سانس لینے کے لیے کوئی جگہ نہ ملے گی۔ زیرِ آب کتنا عرصہ رہیں گی اور سمندر پر جال تنا ہے۔

دو ہفتے کی سالانہ چھٹی کے خاتمے میں کتنے روز باقی تھے؟ وہ فی الحال اپنے آرام کرتے ہوئے خالی ذہن میں اُس بند فیکٹری کی بُو داخل نہیں کرنا چاہتا تھا، جو اگلے ایک برس کے لیے پھر سے اُس کا جغرافیہ اور آب و ہوا ہو گی۔ سمندر کے نمکین لب ابھی سے پیچھے ہٹ رہے تھے اور بریڈ فورڈ کی فیکٹری کا میکانکی جبڑا ہولے ہولے قریب آ رہا تھا۔ علی کانت کی کیمپنگ اس کے لیے کچھ اتنی ثمر آور ثابت نہیں ہوئی تھی۔ یہاں خاندانی جھگڑے زیادہ تھے اور اکلوتے جسم بہت ہی کم، اور جو تھے وُہ اُس کے خیمے میں چت لیٹنے کے بجائے باہر کھلی ہوا میں اوندھا لیٹ کر سن بیدنگ پر زیادہ مائل تھے۔

بادشاہ اور اس کی بلیوں کی رفاقت، مکھی مار مچھلیوں کی سروں میں سے نکلنے والی بُو، انسان کتنی دیر برداشت کر سکتا ہے۔ زمان کو کبھی کبھار ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ بُو اُس کے تن بدن میں رچ گئی ہے اور بریڈ فورڈ واپسی پر وہ کسی طوائف کے قریب گیا تو وہ اُسے کہے گی کہ "تم مچھلی ہو" ٹھیک ہے کل صبح واپسی۔ وطن کی جانب نہیں، برٹینیا بار کی بیئر اور گوری طوائفوں کی طرف۔

کیمپنگ کے استقبالیہ دفتر میں چوکیدار عورت فرش پر تن و توش ڈھیر کیے بیٹھی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سستی وائن کی ایک بوتل تھی اور دوسرے میں ایک لمبی ڈبل روٹی جسے وہ اس سُرخ مشروب کے ساتھ گھٹو روٹی کھا رہی تھی۔ شراب کا گھونٹ حلق سے اُترتا تو وہ اکھاڑے میں اُترنے والے کسی پہلوان کی طرح اپنی وسیع ران پر دھپ جما کر مسرّت کا اظہار کرتی۔

"مجھے اپنا پاسپورٹ اور کرائے کا بل چاہیے۔ کل صبح جانے کا ارادہ ہے۔"

وہ بصد مشکل فرش سے علیحدہ ہوئی اور داخلے کے رجسٹر کے ورق پلٹنے لگی۔

"ہا..... یہاں پر..... پاکستانی..... آج کی شب ملا کر کل چھ دن کا کرایہ ساڑھے چار سو پسیتے۔"

بل وصول کر کے اُس نے پاسپورٹ زمان کے حوالے کیا اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ وائن کی بوتل کو ایک بچھڑے ہوئے محبوب کی طرح بیتابی سے منہ لگایا اور ران پر دھپ جما کر ہنستی ہوئی کہنے لگی "بادشاہ سے خوفزدہ ہو کر کیوں جا رہے ہو، کسی اور مقام پر خیمہ لگا لیتے۔ بدبخت جب یہاں آیا تھا تو کہتا تھا کہ مکھیوں سے پاک نظام رائج کرنے آیا ہوں۔ پانچ سال ہونے کو ہیں، جاتا ہی نہیں۔"

"آپ لوگ اُسے زبردستی کیوں نہیں نکال دیتے؟"

"بس سُستی کہہ لو، بزدلی بھی شاید کہ وہ دماغی طور پر ڈھیلا ہے۔ خواہ مخواہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دے۔ دوسری کیمپنگوں والے ہم پر ہنستے ہیں کہ دیکھو کس خبطی کو اپنے

اُوپر مسلط کر رکھا ہے...... ہا! ختم ہو گئی۔" اُس نے بوتل کے سبز شیشے پر اُبلتی ہوئی آنکھیں رکھ کر یاس سے کہا۔

کیمپنگ کے دفتر سے نکل کر وہ اپنے خیمے کی طرف جا رہا تھا کہ جرمن جوڑے سے ملاقات ہو گئی۔ فرٹز حسب معمول ایک اصیل مُرغا بنا سینہ پُھلائے آگے آگے اور گنتھر اس سے دو قدم پیچھے دست بستہ اپنی حالت میں مست، حکم کا منتظر جیسے شارک کے پہلو بہ پہلو پائلٹ فِش تیرتی ہے۔ زمان کو دیکھ کر اُنھوں نے کچھ کھسر پُسر کی اور پھر فرٹز اکڑ کر بولا "ہے پاکستانی! آج ہفتے کی شام ہے۔ ہم دونوں یہاں سے ۲۰ کلو میٹر کے فاصلے پر بینی ڈورن جا رہے ہیں۔ فَن سٹی، ہسپانوی شیمپین اور تمھارے لیے سنہرے بالوں والی لڑکیاں۔ نائٹ کلب اور ڈسکوز اتنے کہ اگر ایک میں بور ہو جاؤ تو دوسرے کی تلاش میں چلنا نہیں پڑتا۔ وہاں سے نکلو اور برابر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ چلو گے؟"

"فرٹز اپنی سپورٹس کار بھی لے جا رہا ہے۔" گنتھر نے خوشامدی ہیڈ کلرک کی طرح کہا۔

"دو انسان اگر اکٹھے ہوں تو اُسے رفاقت کا نام دیا جاتا ہے مگر تیسرا آ جائے تو اُسے جمگھٹا کہتے ہیں۔" زمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔" فرٹز بولا "دو انسانوں کی رفاقت ہو تو تیسرا جنم لیتا ہے۔"

گنتھر اپنا اُبلتا ہُوا قہقہہ روکنے کی کوشش میں آبدیدہ ہو گیا اور بالآخر مجبور ہو کر پھُوٹ پھُوٹ کر ہنسنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" فرٹز نے پوچھا۔

"فرٹز ضروری تو نہیں کہ دو انسانوں کی رفاقت سے تیسرا جنم لے لے مثلاً....."

"بکواس نہیں کرو شوائن....." فرٹز گرجا اور پھر زمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "چلو گے؟"

زمان نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔ "لیکن بارہ بجے سے پہلے لَوٹ آنا پسند کروں گا،

صبح جا رہا ہوں۔"

فرٹز نے ایک ابرو چڑھا کر کہا۔ "ہم خود بارہ بجے سے پہلے سو جاتے ہیں۔"

"سو جاتے ہیں فرٹز!" گنتھر ایک لالچی بچے کی طرح ہمکنے لگا۔

"تم ہمیشہ بکواس کرتے رہتے ہو شوائن" فرٹز کے پتلے لبوں پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ تیری "ہاں تو پھر شام کو......"

اور پھر وہ اُسی ترتیب سے آگے بڑھ گئے۔

سپورٹس کار کی پچھلی نشست ایک قبر تھی۔ زمان گھُٹنوں پر ٹھوڑی دبائے یُوں پھنسا بیٹھا تھا جیسے کسی سارڈین مچھلی کو دوہرا کر کے ٹین میں پیک کر دیا جائے۔ فرٹز اور گنتھر کے کندھوں کے درمیان میں سے اُسے ونڈ سکرین کا ایک لمبوترا حصّہ نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھار سمندر کی ایک نیلی قاش دکھائی دے جاتی اور پھر فوراً ہی اُس پر ساحلی چٹانیں حاوی ہو جاتیں۔

بینی ڈورن واقعی "فن سٹی" تھا۔ ایک ایسا قصبہ جسے شمالی یورپ کی امیر اقوام نے اپنی شاموں کو سُرخ کرنے کے لیے اس طرح "فتح" کیا تھا کہ اب وہاں مقامی باشندے خال خال ہی نظر آتے تھے اور کہیں نظر آتے؛ وہ تو ایک مکھی کی طرح گندے اور ثروت کے مظاہر میں رینگتے غربت کے کیچوے تھے۔ ان کی غلیظ موجودگی سے رنگینیوں کی لینڈ سکیپ پر دھبے پڑ جاتے تھے۔ چنانچہ تمام سٹورز، کلب، ڈسکوز اور ساحلی بنگلے سویڈز اور جرمنوں کی ملکیت میں تھے اور مقامی لوگ قصبے سے باہر واقع سلمز میں سمٹے ہوئے تھے، تھیلے میں بند مکھیوں کی طرح۔

ایک دیوار پر "ڈسکو سُپر سیکس" کا نیون سائن بھڑک رہا تھا۔ فرٹز نے کار ایک جھٹکے کے ساتھ منجمد کر دی۔ دیوار کے پہلو میں سے ایک ہسپانوی بلیوں کی سی آہستہ خرامی سے اُن کی جانب آیا۔ "ڈسکو میوزک۔ فری شیمپین اور گرلز...... دو سو پیسیتے فی کس۔"

"گرلز؟" فرٹز نے دانت پیس کر کار سٹارٹ کر دی۔

اِس کے بعد متعدد جگہوں پر کار روکی گئی مگر نسخہ وہی تھا۔ "ڈسکو میوزک۔ فری شیمپئن اور گرلز...... اتنے سو پیسنے" فرٹز نہایت غور سے مینو سنتا اور "گرلز" کا ڈنک کھا کر جبڑوں کو بھینچ کر کسمساتے ہوئے کار سٹارٹ کر دیتا۔

بالآخر وہ قصبے سے ہٹ کر ایک نیم تاریک گلی میں داخل ہوئے جہاں پر مینو کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا یعنی "ڈسکو میوزک، فری شیمپئن اور صنفِ موافق...."
فرٹز نے کار پارک کی اور زمان کو بڑی ملائمت سے کہنے لگا "تم ذرا اس کار کے پاس رکو، ہم دیکھ کر آتے ہیں کہ کیسی جگہ ہے" قریباً نصف گھنٹے کے بعد وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے باہر نکلے "فضول جگہ ہے۔ کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈتے ہیں۔"

اِسی قسم کی ایک اور ڈسکو کے باہر فرٹز نے ایک مرتبہ پھر زمان کو کار کے پاس چھوڑا اور معائنے کی خاطر اندر چلے گئے۔ زمان کار کے بونٹ پر بیٹھا اکڑتا رہا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب وہ باہر آئے تو فرٹز زمان پر پھٹ پڑا "تمھیں معلوم نہیں کہ اس کار کی کیا قیمت ہے؟ شاید تم سے بھی زیادہ......" گنتھر نے اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم نرم پڑ گیا "میرا مطلب ہے بونٹ پر بیٹھنے سے خواہ مخواہ ڈینٹ پڑ جائے گا...... یہ جگہ بھی اتنی خاص نہیں کہیں اور چلتے ہیں۔"

رات کے بارہ بجے تک وہ پانچ مختلف ڈسکوز میں گئے اور انھیں ناموزوں قرار دے کر واپس آ گئے۔ البتہ ہر مرتبہ وہ پہلے سے زیادہ ہنستے ہوئے اور جھومتے ہوئے باہر نکلتے۔

"پھر کسی روز قسمت آزمائیں گے پاکستانی" فرٹز نے آخری ڈسکو میں سے نکلتے ہوئے خمار آلود آنکھوں کے پپوٹے چڑھاتے ہوئے کہا "آؤ واپس چلیں۔"

علی کانٹ واپسی پر پچھلی نشست کی قبر میں دھنسے ہوئے یکدم زمان پر انکشاف ہوا کہ اُسے ہمراہ لے جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ فرٹز کی قیمتی سپورٹس کار کی چوکیداری کے فرائض انجام دیتا رہے...... شوائن۔

خوشبو مجھے بلاتی ہے۔ میرا پیٹ خالی ہے اور میں کھنچا چلا جا رہا ہوں میں بھنبھنا رہا ہوں اور یہ بھنبھناہٹ میرے بازوؤں میں سے خارج ہو رہی ہے۔ میں اُڑ رہا ہوں۔ میرے پاؤں کہاں ہیں؟ پیٹ کے ساتھ۔ پیٹ جو خالی ہے۔ میں خود ایک مکھی ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے گرد مکھیوں کا ایک انبوہ ہے مگر اُن کے چہرے انسانی ہیں اور دھڑ مکھیوں کے۔ ہر ایک کے چہرے پر کرب کا ایک لفظ کھدا ہوا ہے جس کے اپنے کوئی معانی نہیں مگر اُن سب چہروں کے لفظ مل کر کرب کی کریہہ تصویر بنا رہے ہیں۔ اُن کی لٹکتی ہوئی انسانی زبانیں خوراک کی متلاشی ہیں۔ خوراک جو خوشبو کی پاگل اُڑان سے ہی حاصل ہو گی۔ ہم خوشبو کے اسیر ہیں ہم خوشبو کے پجاری ہیں اور اُس راستے پر گامزن ہیں جس کے خاتمے پر وہ مندر ہے جس میں خوراک کا دیوتا ہے ہم کھنچے چلے جا رہے ہیں اُس ٹریپ کی جانب جس میں سے خوشبو آ رہی ہے، بادشاہ کے بنائے ٹریپ کی طرف۔ لاکھوں انسانی چہرے ہیں کھوکھلے، پچکے ہوئے جو اُڑان میں ہیں۔ بھوک کے پیٹ سے ٹانگیں چپکائے خوشبو کے راستے پر مائل سفر جس کے اختتام پر خوراک ملنے کی اُمید ہے۔ فنا کا سرد خوف تحلیل ہو رہا ہے اور پیٹ بھرنے کی اُمید راستے میں بچھی جاتی ہے...... میں مست ہوں۔ یہ جہان کونسا ہے اور کن ساعتوں کی واردات مجھ پر بیت رہی ہے۔ اک عالمِ خواب ہے، یا میں سچ مچ ایک مکھی میں بدل چکا ہوں۔ دوسرے کوٹھے پر کھڑے درباری کیوں اپنی ڈور نہیں توڑتے۔ سوکھتے لبوں اور پچکے جسموں والے لاکھوں بچے منتظر ہیں۔ خوشبو مجھے بلاتی ہے...... بلاتی ہے۔

اور بادشاہ کا سر ذہن کے مینٹل پیس پر سجا مسکرا رہا ہے۔

زمان نے کروٹ بدلی۔ باہر رات تھی، سمندر خاموش تھا۔ اُس نے اُٹھ کر سگرٹ سلگا لیا۔ بُو تھی، صرف مچھلی کی نہیں، بلکہ ایک تازہ اور رقت لانے والی بُو جیسے تازہ ذبح شدہ بکرے کے گوشت میں سے مہک آتی ہے۔ گوشت پر چھری چلنے کے فوراً بعد جو ہواڑ آتی ہے ویسی؛ بلبلیاں مرو رہی تھیں۔ ایک اور آواز بھی تھی۔ بکرے

کے نرغے میں سے خارج ہونے والے موت کے خراٹوں ایسی حیوانی آواز۔ بے پناہ بو بھری سگرٹ ختم کر کے زمان نے سلیپنگ بیگ کو اپنے چہرے پر کھینچا اور لو کی اس بوچھاڑ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔

باہر دن چمک رہا تھا۔

زمان پچھلی شب کی نیم خوابی کے باعث خاصی دیر تک سویا رہا اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو باہر دن چمک رہا تھا۔ اُس نے انتہائی عجلت میں اپنا سامان رُک سیک میں ٹھونسا اور خیمہ اکھاڑنے کی نیت سے باہر آگیا۔ باہر دن چمک رہا تھا۔ ساحلِ سُورج پر اتنی تیز روشنی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ پہلی میخ کو زمین سے علیحدہ کرتے ہوئے لاشعوری طور پر اُس کی نگاہ بادشاہ کے خیمے کی طرف چلی گئی۔

پردہ گرا ہوا تھا اس کا اخبار خیمے کے باہر رکھی کرسی پر اَن کھلا پڑا تھا۔ اگرچہ ہوا تھی مگر جھنڈا نما چیتھڑا لہرا نہیں رہا تھا۔ بلّیاں بھی غائب تھیں۔ بادشاہ کے ٹریپ پر ان تھے اُن پر مکھیوں کے غول نہ تھے۔

بوڑھا ہر صبح سات بجے اپنی بلیوں سمیت خیمے سے باہر آکر اپنی کرسی پر براجمان ہو جایا کرتا ہے۔ آج دن چڑھے تک جانے اندر بیٹھا کیا کر رہا ہے یا شاید کسی کام کے سلسلے میں شہر چلا گیا ہو مگر وہ تو صبح سے شام تک صرف ایک کام کرتا تھا۔ کیچو سے بھرے تھیلوں کو گھسیٹ کر سمندر میں ڈبونے کا....... بہر حال....... زمان نے لاپرواہی سے کندھے سکیڑے اور میخیں اکھاڑ نا رہا۔ خیمہ لپیٹ کر اُس نے رُک سیک پر باندھا اور اُسے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ بادشاہ کے خیمے کا پردہ ابھی تک گرا ہوا تھا۔

زمان باہر جانے کے لیے چند قدم چلا اور پھر کچھ سوچ کر واپس آگیا۔ روانگی سے پیشتر بادشاہ کو خدا حافظ ضرور کہنا چاہیے، آخر وہ اتنے روز اس کی ہمسائیگی میں رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر خیمے کا پردہ سرکایا اور اندر جھانکا۔

وہیل زیرِ آب جاتی ہے موت سے خائف ہو کر۔ مہیب پانیوں میں روپوش ہو

ہو جانا چاہتی ہے مگر اُسے سانس لینے کے لیے کبھی نہ کبھی سطحِ آب پر آنا پڑتا ہے اور سطح پر ایک آخری نیزہ اُس کا منتظر ہوتا ہے اور آخری نیزہ اپنی نشگفتی نال اس کے جسم میں گاڑ دیتا ہے۔ وہیل کا جثہ آخری مرتبہ ایک مخصوص رنگ کی سرخی میں رنگنے لگتا ہے، اور اس غروب کو ماہی گیر سُرخ پھول کہتے ہیں۔

اندر بُو تھی اور بھنبھناہٹ تھی۔

ایک کونے میں بلیوں کا ہجوم خاموش بیٹھا زبانیں چاٹ رہا تھا۔

اُس کی بتیسی پر ماس نہ تھا مگر وہ مسکرا رہا تھا اور نقلی دانت حلق میں پھنسے دکھائی دے رہے تھے۔

ہڈیاں ننگی تھیں۔ لوتھڑے لٹک رہے تھے۔ اور جہاں گوشت باقی تھا اُس پر گاڑے ہوئے دانتوں اور ادھیڑتے ہوئے پنجوں کے خون آلود سُرخ نشان ثبت تھے۔

اور لمحۂ آخر کی پہچان نہ کرنے والی ہڈیوں اور گوشت پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

اور بادشاہ کا مسخ شدہ چہرہ زمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بادشاہ ننگا تھا۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمن! دی کنگ از ڈیڈ!!

ذات کا قتل

انتونیو نے مانتیلا کی بوتل اُٹھا کر اپنے گرم ماتھے کے ساتھ لگا دی۔ چاند کی کرنیں بوتل میں باقی ماندہ شراب کے قطروں میں جھلملائیں اور منعکس ہو کر اس کی کالی بھور مخمور آنکھوں میں اُترتی چلی گئیں۔ "وِلیا" اِس کی بھرائی ہوئی آواز بُل رِنگ کی ہزاروں خالی نشستوں سے ٹکرا کر گونجی اور اُس نے بوتل ماتھے سے دھیرے دھیرے سرکا کے اپنے منہ میں اُنڈیل لی۔

قرطبہ کا وسیع و عریض بُل رِنگ پچھلے پہر کی مدھم چاندنی میں کسی قدیم یونانی تھیٹر کے کھنڈر کی طرح اُداس اور ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ خاموشی ہر سُو پَر پھیلائے سو رہی تھی۔ بُل رِنگ کی تیسری منزل کے اُوپر ایک چھجّا آیا ہُوا تھا اور وہاں مکمل اندھیرے کا راج تھا۔ دوسری منزل کے خدو خال بھی پوری طرح عیاں نہ تھے۔ البتہ نچلی منزل کی خالی نشستیں قطار اندر قطار چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ انتونیو نے خالی بوتل کے سبز شیشے پر اپنے سنسناتے ہوئے لب رگڑے پھر بے حد احتیاط سے اگلی نشست

پر لٹا کر اسے اُنگلی سے چھُو دیا۔ بوتل ایک جھُولنے کی طرح جھُولی اور پھر دوسری نشست پر لڑھک گئی۔ ایک......... دو......... تین ـــــ انتونیو جلدی جلدی نشستوں کی اُن منزلوں کو گِننے لگا جنھیں لُڑھکتی ہوئی بوتل اپنے مومنٹم میں تیزی سے طے کر رہی تھی۔ بائیس تیئیس...... اور پھر اُسی سَمے بوتل کے ٹوٹنے کی آواز ایک چھناکے سے پورے بُل رِنگ میں منتشر ہو گئی۔ شراب کے ایک ایک گھونٹ سے تعمیر شدہ عارضی سکون کی جو دیوار انتونیو نے پچھلے دو گھنٹوں میں اپنے سیمابی ہیجان کی بنیاد پر تعمیر کی تھی وہ ڈولنے لگی اور پھر دھڑام سے نیچے آگری۔

"تم خوفزدہ ہو انتونیو" ایک اندر کی آواز نے چُپکے سے کہا۔ انتونیو نے بمشکل سَر اُٹھا کر چاروں اور دیکھا۔ پورا بُل رِنگ سنسان پڑا تھا۔

"آج دوپہر انتونیو ـــــ آج دوپہر" ایک اور سرگوشی ہُوئی۔

انتونیو کا اندر ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ پارے کے ایک اتھاہ سمندر میں یہ ٹکڑے چٹانوں، برفانی تودوں اور جزیروں کی مانند اُبھرتے اور ڈوب جاتے۔ عظیم بُل فائٹر بننے کا جزیرہ۔ آج کے دن تک پہنچنے کے لیے سالہا سال کی شب و روز کی محنت اور ذاتی خواہشات کی قربانی کی چٹانیں۔ بُل فائٹر بننے کے لیے بے پناہ پیدائشی صلاحیت کا برفانی تودہ اور پھر اس پورے سمندر میں خوف اور دہشت کے سنپولیے تیرتے ہوئے...... جن کے زہر کا نشہ آور تریاق اس نے شراب میں ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

انتونیو قرطبہ کے سان مرینو محلے میں رہائش پذیر چمڑے پر نقش و نگار بنانے والے ایک دستکار کا بیٹا تھا۔ "بُل فائٹروں کے محلے" میں روائت کے مطابق ہر لڑکا پیدائشی طور پر بُل فائٹر ہوتا ہے۔ اس کی تنگ گلیوں اور سفید مکانوں میں مونالیت، دیخو اور گورینیا جیسے اُندلس کے عظیم بُل فائٹروں نے پرورش پائی۔ آج ہسپانیہ اور جنوبی امریکہ کے ہر باشندے کے دل میں عیسیٰ اور مریم کے بعد انہی تین بُل فائٹروں کے لیے عقیدت کے چراغ جلتے ہیں۔ انتونیو کو بھی سان مرینو

میں رہنے والے تمام بچوں کی طرح پختہ یقین تھا کہ ایک روز "میوزےو دے توروس" یعنی بُل فائٹنگ کے عجائب گھر میں ایک اور ہال کی تعمیر ہوگی جس میں انتونیو کے ہاتھوں مارے جانے والے بُل کی کھال لٹکے گی۔ اُس کا زرق برق لباس شیشے کے شوکیس میں تہ کر کے رکھا ہوگا اور اس کا قدِ آدم مجسمہ ہال کے وسط میں نصب کیا جائے گا۔

انتونیو گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے باپ کی نیم تاریک ورکشاپ میں بیٹھنے کی بجائے قرطبہ کے نواحی دیہات کی جانب نکل جاتا جہاں "ناولڈو" نامی بُل فائٹس کثرت سے ہوتی ہیں۔ اِن بُل فائٹوں میں نوعمر بھینسوں کے ساتھ کھیلا جاتا ہے اور حسبِ روایت کھیل کے اختتام پر اُنھیں ہلاک نہیں کیا جاتا۔ سان مرینو کے باشندے انتونیو کی بہادری کے اس روز قائل ہوئے جب ایک وحشی بُل اکھاڑے کی گیلری پھلانگ کر تماشائیوں کی نشستوں پر چڑھ آیا تھا اور انتونیو نے گیلری پر رکھی کسی بُل فائٹر کی تلوار اُٹھا کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ اسکول سے فارغ ہوتے ہی وہ میڈرڈ چلا گیا اور پھر پورے تین برس کا ساڈی مورو کے جنگل میں درختوں کے پتے سمیٹ سمیٹ کر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ وہ میڈرڈ کے بُل فائٹنگ سکول میں داخلہ لے سکے۔ صرف دو ہفتے بیشتر اُسے پلازا دے توروس میڈرڈ میں پروفیشنل بُل فائٹر کے خطاب سے نوازا گیا تھا اور آج تچھلے پہر قرطبہ کے اِسی بُل رنگ میں اس کی پہلی بُل فائٹ تھی۔ قرطبہ جہاں کے رہنے والے اِس کھیل کے رسیا تھے اور وہ ایک بُل فائٹر کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر ہی اُس کے حق میں فیصلہ دیا کرتے تھے۔

انتونیو نے جھک کر اکھاڑے کی ریت کو چھوا، سرد اور خشک — آج دوپہر اسی ریت کو اندلس کے سُورج کی تمازت سے تپ جانا تھا اور بہرطور رنم ہونا تھا....
کیا اِس ریت پر بُل کا خون گِرے گا یا انتونیو کا ؟ وُہ آہستہ آہستہ چلتا سُرخ پھاٹک کے پاس آ گیا جس میں سے آج دوپہر ایک ایسے سیاہ جانور کو برآمد ہونا تھا جو اُسے

یا تو شہرت کی بلندیوں سے ہمکنار کر دے گا یا پھر عمر بھر کے لیے اس کوٹھڑی کو مقدر بنا دے گا جس میں کئی صدیوں سے اُس کے آباؤ اجداد چمڑے پر نقوش بنا کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ انتونیو نے جھک کر اپنے ہونٹ تازہ روغن شدہ سُرخ پھاٹک پر چسپاں کر دیئے۔

بُل رِنگ میں ہُو کا عالم تھا۔
بوڑھے کارلوس نے اپنا رعشہ زدہ ہاتھ سُرخ پھاٹک پر رکھا اور پھر اُسے پوری قوت سے دھکیل کر خود گیلری کے ساتھ چپک گیا۔ چمکتی سیاہ کھال کا ایک خوفناک جسم برق رفتاری سے اکھاڑے میں داخل ہُوا۔ گیلری کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگانے کے بعد ریت میں اپنے سُم گاڑے اور پھر سر اُٹھا کر ان لاتعداد خاموش لوگوں کی جانب دیکھا جو قرطبہ کے بُل رِنگ میں اس کی آمد کے منتظر تھے۔ اس کے ساتھ ہزاروں تماشائیوں کے ہاتھ بلند ہوئے اور تالیوں اور نعروں کا شور بُل رنگ کی فضا سے اُڑ کر پورے شہر پر چھا گیا۔ انتونیو کا بوڑھا باپ اپنی ورکشاپ کے ایک کونے میں چمڑے پر کندہ مریم کی شبیہہ کے آگے جھک گیا "مقدس مریم انتونیو کی لاج رکھیو"

انتونیو سنہری بروکیڈ کی جیکٹ، چمکیلے نگوں اور گوٹے کناری سے مزّین تپلون اور چمڑے کے بوٹوں میں ملبوس گیلری پر ہاتھ رکھے بُل پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اُس کے معاونین بُل رنگ میں داخل ہو کر بُل کی شوخی اور تیزی کو دھیما کرنے کی خاطر اُس سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ نیند کی کمی کے باعث اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ وُہ پچھلی شب بُل رِنگ سے سیدھا گھر لوٹنے کی بجائے پلازا ٹری کا پوچینو کے درمیان نصب عیسٰی کے مجسمے کے قدموں میں بیٹھا موم بتیاں جلاتا رہا اور پھر وہیں سو گیا۔ بیدار ہونے پر پہلی آواز جو اُس کے کانوں سے ٹکرائی وہ مسجد قرطبہ کے مینار پر نصب شدہ گھڑیال کی تھی۔ شاید اُسے یاد دلانے کے لیے کہ بُل فائٹنگ کا کھیل

موروں کی اختراع تھا۔" اگر موروں کے خدا سے بھی صلح رکھی جائے تو کیا حرج ہے؟"
انتونیو نے راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود سوچا اور باب الزوبہ کے راستے مسجد کے اندر چلا گیا۔ لمبی قباؤں اور سبز پگڑیوں والے مور اپنے خدا کی پرستش کس طرح کرتے تھے اس کے بارے میں وہ لاعلم تھا۔ اس نے محراب پر لکھی ہوئی عربی عبارت پر بڑے احترام سے اپنا ہاتھ رکھا اور پھر جلدی سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر باہر آ گیا۔

اس نے بل رنگ میں بیٹھے ہزاروں تماشائیوں کی جانب دیکھا جو اس کا فن دیکھنے کے منتظر تھے اور پھر اس کی نگاہ ایک علیحدہ کیبن میں بیٹھے پادرو کے سنجیدہ چہرے پر ٹھہر گئی۔ پادرو قرطبہ کے مشہور رومی ادیب اور فلاسفر سنیکا سے بے حد مشابہت رکھتا تھا۔ گٹھا ہوا کسرتی جسم جس کے کندھوں پر ایک غیر معمولی طور پر بڑا اور گنجا سر کچھ یوں نصب تھا جیسے بوقتِ ضرورت اسے اٹھا کر علیحدہ بھی رکھا جا سکتا ہو۔ پادرو اپنے زمانے میں ایک معروف بل فائٹر تھا۔ مگر کھیل کی سائنسی تکنیک پر مکمل عبور ہونے کے باوجود اس کی شہرت قرطبہ کی فصیلوں تک ہی محدود رہی۔ اس کے کھیل میں ایک درسی مظاہرے کی سی کیفیت ملتی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی شہرت شہر کی فصیلوں سے سمٹ کر ایک مقامی قہوہ خانے "بار مسکیتا" کے ایک کونے تک محدود ہو کر رہ گئی جہاں اس کے چند وفادار مداح راکھ کے اس ڈھیر میں سے چنگاریاں حاصل کرنے کی سعیِ لاحاصل میں مصروف رہتے۔ دو برس پیشتر اس کا ایک دیرینہ مداح میڈرڈ کے بااثر اخبار "اسپانا" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوا تو اس نے اپنے رسوخ سے پادرو کو بل فائٹنگ کا ہفتہ وار کالم دلوا دیا۔ بل فائٹنگ کے حلقوں میں کہا جاتا تھا کہ بل فائٹر کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پالا کسی ناراض بل سے پڑے اور اس کا سامنا مسکراتے ہوئے پادرو سے ہو۔ کیونکہ پادرو کے ہفتہ وار کالم میں کسی بھی بل فائٹر کی مدح میں ایک سطر اسے پلک جھپکتے میں بل فائٹنگ کے بیسیوں کنٹریکٹ دلوا سکتی تھی اور تنقید کا ایک لفظ بھی اس کی

پیشہ ورانہ زندگی کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔
انتونیو نے پادرو کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا مگر وہ ایک درجہ دوم کے گوتم بدھ کی مانند پتھر بنا بیٹھا رہا۔ اس نے پادرو کے ناراض چہرے سے نظریں ہٹا کر اس سے کہیں زیادہ ناراض بل کی چمکیلی تھوتھنی پر جما دیں اور اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگا۔ بل دائیں سینگ کو ایک خاص زاویے سے جھکا کر حملہ آور ہوتا تھا۔ گردن قدرے ٹیڑھی کر کے دیکھتا تھا اور اس کی بائیں آنکھ نسبتاً زیادہ چمکیلی تھی۔ اتنے میں بگل بجا اور معاونین اکھاڑے سے باہر چلے گئے۔ انتونیو نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ سمندر میں تیرتے ہوئے خوف کے سنپولیوں کو ڈبونے کی کوشش میں تھوک نگلا اور سرخ کپڑا ہاتھ میں پکڑ کر تالیوں کی گونج میں اکھاڑے میں اتر آیا۔
"ہے ہے ہے" انتونیو نے رندھے ہوئے گلے سے اسے پکارا۔ بل پیچھے مڑا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں انتونیو کے شوخ اور بھڑکیلے لباس پر جمی تھیں۔ چوڑا ماتھا، سر اور سُم چھوٹے، موٹی گردن، سینگ آگے کو مڑے ہوئے۔ ایک بہترین نسل کا طاقتور اور مغرور بل......
انتونیو اپنے آگے سرخ کپڑا کچھ یوں تانے کھڑا تھا جیسے وہ اس کے پیچھے بالکل برہنہ کھڑا ہو۔ ایک مرتبہ پھر آہستہ سے "ہو۔ ہوئے تورو"۔ بل نے سرخ دیوار پر نظریں جمائیں اور ایک دم حملہ کر دیا۔ جونہی بل کے سینگ کپڑے کو چھوئے انتونیو انتہائی خوبصورتی اور پھرتی سے پنجوں پر گھوم گیا اور بل اپنی طاقت کے زور میں بھاگتا ہوا خاصا دور نکل گیا۔ بے پناہ تالیوں کی ایک باڑ بل رنگ کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔
"ہو ہو...... آؤ...... آ جاؤ" انتونیو پنجوں پر کھڑا گردن گھما کر اپنے پیچھے کھڑے بل کو پھر حملے کی دعوت دینے لگا۔ بل نے اپنے سُم ریت میں رگڑے اور اس مرتبہ اپنے حریف کو ہلاک کر دینے کی نیت سے نہایت نپے تلے انداز میں دوڑتا ہوا آیا۔ انتونیو نے بل کے قریب آنے سے لمحہ بھر پہلے ہی سرخ کپڑا پھریرے کی صورت میں ہوا میں لہرا دیا اور بل کے سینگ اس کی بروکیڈ کی جیکٹ کو رگڑتے

ہوئے گذر گئے ..... "ورُونیکا پاس" کے یہ دو مظاہرے اگرچہ بہترین کلاسیکی انداز کے حامل تھے۔ مگر ان میں بُل فائٹر کی ذات کا اظہار کچھ یُوں رَس بس گیا تھا کہ انھیں "انتونیو وردنیکا" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ تالیوں اور سیٹیوں کے متواتر شور میں انتونیو بُل سے کھیلتا رہا۔ اب اس کے اندر ایک پُرسکون سمندر تھا جس میں صرف بے خوفی اور عظمت کی چٹانیں کھڑی تھیں۔ خوف اور ناکامی کے سفینے اِن سے ٹکرا کر ہلاک ہو چکے تھے۔

بُل فائٹ کی دوسری باری میں گھڑ سوار پکاڈور اکھاڑے میں آیا اور بُل کو دھیما کرنے کے لیے اپنے برچھے سے اُس کی گردن کو لہولہان کر دیا۔ بُل کی گردن میں کمال ہُنرمندی سے باندریلو یعنی چھوٹی برچھیاں پیوست کرنے کے بعد انتونیو مولینا میں لپٹی ہوئی تلوار بغل میں دبائے صدر کی کیبن کے آگے جُھک گیا اور بُل کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے جواب میں سُرخ رُومال ہلا دیا۔

بُل کی شوخی، مُستعدی و تیزی گئے وقتوں کا خواب تھی۔ اُس کی گردن میں چُبھی ہوئی چھ برچھیوں کی اذیّت اُسے بے چین کیے دیتی تھی اور اس کا خون رِس رِس کر اکھاڑے کی ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ انتونیو نے اپنی سُنہری ٹوپی سر سے اُتار کر اکھاڑے میں پٹخ دی، مولینا میں سے تلوار نکال کر اُسے چُوما "ہے تورو" اُس نے سرگوشی کی۔ بُل نے بمشکل سر اُٹھایا۔ قرطبہ کی تپتی دوپہر میں تلوار کی نوک ہیرے کی کنی کی طرح چمکتی دھیرے دھیرے اُس کے ماتھے کے قریب آ رہی تھی۔ شاید بُل اس وقت اپنے ماتھے میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کوئی آہستہ آہستہ اپنی اُنگلی آپ کے ماتھے کی جانب بڑھائے تو اس میں ایک نامعلوم قسم کی جلن ہونے لگتی ہے۔ بُل نے سر جھٹکا اور پُوری قوّت سے انتونیو پر حملہ کر دیا۔ انتونیو ایک چٹان کی مانند ساکت ہو گیا اور جُوں ہی بُل اس کے نزدیک پہنچا اُس نے تلوار اُس کی گردن اور کولھوں کے درمیان گھونپ دی۔ انتونیو کی بند مٹھی اور تلوار کا دستہ بُل کی چمکتی کھال پر تیرتے پسینے سے مَس ہوئے۔

بُل کی چمکیلی آنکھیں بُجھنے سے قبل حیرت سے پھیل گئیں جیسے کہہ رہی ہوں ہم تو صرف کھیل رہے تھے یہ تم نے کیا کیا؟ پھر اُس کی ٹانگیں یُوں لرزیں جیسے کسی نے اُن میں سے ہڈیاں کھینچ ڈالی ہوں اور وُہ کپکپا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مریم کی شبیہہ کے آگے جُھکے انتونیو کے باپ کے کانوں میں بُل رِنگ سے اُبلتا ہُوا تالیوں کا شور ایک دل آویز دُھن کی صورت میں اُترا اور وُہ سجدہ ریز ہو گیا۔ بلاشُبہ آج قرطبہ کے بُل رِنگ کی ریت پر ایک ایسے بُل فائٹر کے قدم جمے ہوئے تھے جو عظیم مونالیت سے کسی طور کم نہ تھا۔ سان مرینو کے محلے میں پروردہ تین عظیم بُل فائٹروں کے ساتھ اب انتونیو بھی کندھے ملائے کھڑا تھا۔ تماشائیوں کے ہاتھ جب تالیاں پیٹ پیٹ کر دُکھنے لگے اور اُن کے گلے رُندھ گئے تو اُنھوں نے اکھاڑے پر دھاوا بول دیا اور انتونیو کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ انتونیو نے اپنی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی پُونچھے بغیر بڑے فخر سے پادری کی کیبن کی جانب دیکھا۔ پادری جا چکا تھا۔

اُس رات قرطبہ کے گلی کوچوں میں لالٹینوں کی ناکافی روشنی تلے انتونیو کی شجاعت کی داستانیں سُنائی جا رہی تھیں۔ اس کے خوبصورت فن کی داد دی جا رہی تھی۔ چوکوں کے وسط میں فوّاروں کی منڈیروں پر بیٹھے لوگ اس کا تذکرہ کر رہے تھے اور شہر کے تمام قہوہ خانوں میں ایک ہی موضوع تھا...... انتونیو! مسجد قرطبہ کی دیوار کے سامنے "بار سکینا" میں انتونیو دوستوں اور مداحوں کے ہجوم میں گھرا اپنے تاثرات بیان کر رہا تھا ــــ شراب خانے کے مالک نے کاؤنٹر کے پیچھے دیوار پر انتونیو کی تصویر مونالیت کے خاکے کے ساتھ آویزاں کر دی تھی۔

"میونے دے تو روس" کے اس ہال کے نام جواب ہمارے انتونیو کے لیے تعمیر ہوگا" مالک نے شمپیئن کی ایک بوتل کا کارک اُڑاتے ہوئے جوش میں آ کر کہا۔

"وِلیا" سب نے مل کر نعرہ لگایا اور اپنے گلاس خالی کر دیئے۔

"گراسیاس سینیور" انتونیو نے جذبات سے رُندھی ہوئی آواز میں شکریہ ادا کیا اور پھر اُس کی نظریں قہوہ خانے کے اُس کونے پر ٹھہر گئیں جہاں پادرو اس ہنگامے سے لاتعلق سر جھکائے برانڈی پی رہا تھا۔

"انکل پادرو! میں آپ کی رائے جاننے کے لیے بے چین ہوں" انتونیو اپنا گلاس اُٹھا کر پادرو کے پاس چلا آیا۔

"میں اپنی رائے کا اظہار صرف "اسپانا" کے کالم میں کرتا ہوں۔ پرسوں پڑھ لینا" پادرو نے سرد مہری سے جواب دیا اور پھر سر جھکا کر برانڈی پینے میں مشغول ہو گیا۔

چنبیلی اور نارنگیوں کی ملی جلی خوشبو سمیٹے خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا کھلی کھڑکی میں سے آیا اور انتونیو نے آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف روشنی تھی چُندھیا دینے والی روشنی۔ اُس کے بدن کا رُواں رُواں دُکھ رہا تھا۔ سوجی ہوئی سُرخ آنکھوں میں روشنی کی کرنیں کسی پکاڈور کی برچھی کی طرح چُبھ رہی تھیں۔ یہ پچھلے دو روز کی دعوتوں میں کثرتِ شراب نوشی کے آثار تھے۔ وہ ماتھے پر ہتھیلی جمائے بمشکل بستر سے اُٹھا اور نیچے پاتیو میں آ گیا جہاں خوبصورت آہنی جنگلے میں آج کا "اسپانا" اٹکا ہوا تھا۔ انتونیو نے فوراً اخبار اُٹھایا اور بے صبری سے صفحات اُلٹنے لگا۔

"انتونیو۔ بُل فائٹنگ کا قاتل" پادرو کے کالم کی سُرخی تھی۔

"ہا۔ انکل پادرو کا لطیف مزاح" انتونیو نے سوچا اور دھڑکتے دل سے کالم پڑھنے لگا۔ آخری سطروں تک پہنچتے پہنچتے اُس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" اُس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ "انکل پادرو میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا" اس خیال سے کہ شاید وہ پادرو کی ادبی زبان کو سمجھ نہیں سکا۔ اس نے کالم ایک مرتبہ پھر شروع سے آخر تک پڑھا۔ نہیں یہ ادبی مزاح بھی نہیں تھا۔

یہ ایک ایسا کالم تھا جو جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انتونیو کو مکمل طور پر برباد کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ بقول پادرو "پچھلے اتوار انتونیو نامی ایک غیر معروف بُل فائٹر نے قرطبہ کے اکھاڑے میں اپنے بچگانہ کھیل اور اس میں اپنی ذات کے اظہار کی کوشش میں بُل فائٹنگ کے کھیل کا مستقبل تاریک کر دیا۔ بُل فائٹنگ کے قدیمی ورثے میں اگر سائنسی تکنیک کے ساتھ ذات کا اظہار بھی شامل کر دیا جائے تو پھر اُسے بُل فائٹنگ نہیں کہا جا سکتا۔ انتونیو نے تکنیک پر ذاتی اختراع کو ترجیح دی ہے۔ بُل فائٹنگ میں اگر لگے بندھے اصولوں پر بُل فائٹر کی ذات حاوی ہو جائے تو اُسے بُل رِنگ کی بجائے کسی سرکس کا رُخ کرنا چاہیے۔"

پادرو نے ان چند سطروں سے ریاضت، شوق اور لگن کی اُس عمارت کو ڈھا دیا تھا جسے انتونیو نے اپنی زندگی کے بہترین برسوں کی قربانی سے تعمیر کیا تھا۔ اس نے "اسپانا" تہ کر کے جیب میں اُڑسا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا "بار مسکیتا" میں آ گیا۔ خالی شراب خانے کے کاؤنٹر کے پیچھے مالک کی لڑکی ماریا ایک کپڑے سے گلاس چمکانے میں مصروف تھی۔ انتونیو کو دیکھتے ہی اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیک کر کہنے لگی "اوہ انتونیو تم کتنے عظیم ہو!" انتونیو نے مُسکرانے کی کوشش کی مگر اُس کی آنکھوں میں نمی کی لکیر بوجھل ہونے لگی اور اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ اس کی پسندیدہ شراب مونتیلا کی بوتل اور گلاس میز پر رکھنے کے بعد ماریا کولھوں پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے بولی "انتونیو! قرطبہ میں صرف پادرو ہی تو نہیں ہزاروں دوسرے لوگ بھی تو ہیں جنھوں نے تمھارا کھیل دیکھا تھا اور تم...... اُستد غناسیکو" اس نے جھک کر انتونیو کی پیشانی پر بوسہ دیا "مقدس مریم نے چاہا تو پادرو جہنّم کی آگ میں جلے گا۔"

انتونیو نے بوتل کھول کر شراب گلاس میں اُنڈیلی اور پھر اُسے ایک ہی سانس میں خالی کر کے بوتل کو مُنہ لگا لیا...... بوتل میں بقیہ ماندہ شراب کے قطرے چھت سے لٹکی لالٹین کی روشنی میں جگمگائے اور اُس کے دل میں اُداسی تہ در تہ

اُترنے لگی۔ بے خوفی اور عظمت کی چٹانیں ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں۔ خوف اور ناکامی کے ادھ مُوئے سنپولیئے پھر سَر اُٹھا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ شراب خانہ بھرنے لگا۔ دوسری میزوں پر بیٹھے لوگ اس کی جانب دیکھتے اور سر جوڑ کر کھسر پھسر کرنے لگتے۔ پرسوں شب کے برعکس ماحول بیحد سنجیدہ تھا۔

"ہیلو انتونیو" اُس نے سَر اُٹھا کر دیکھا تو درجہ دوم کا گوتم بُدھ مسکرا رہا تھا۔

"ڈان منوئل پادرو" انتونیو نے نہایت ادب سے جواب دیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "انکل پادرو میں ہمیشہ سے آپ کی عزت کرتا چلا آیا ہوں...... ایک بزرگ کی حیثیت سے ــ میں جاننا چاہتا ہوں کہ......" اس نے جیب میں سے "اسپاتا" نکال کر پادرو کے سامنے پھیلا دیا۔ "کہ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

"قصور؟" پادرو کا چہرہ مسکراہٹ سے ایک دم عاری ہو گیا۔ "تم نے بُل فائٹنگ کی مقدس روایت کو توڑنے کا جرم کیا ہے۔ ویرونیکا پاس دیتے وقت دائیں کی بجائے تمھاری نظریں بائیں جانب تھیں۔ تم نے پنجوں پر گھومتے ہوئے سُرخ کپڑا پوری طرح نہیں سمیٹا تھا۔ تمھاری گردن کا زاویہ درست نہیں تھا۔ انتونیو بُل فائٹنگ کے فن میں بُل فائٹر کو ذات کے اظہار کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔"

"پادرو انکل" انتونیو کی آنکھیں غصّے سے اُبلنے لگیں۔ "میں ایک چابی کی گڑیا نہیں ہوں جس کی حرکات سراسر میکانکی ہوتی ہیں۔ میں ایک سوچنے والا جانور ہوں۔ میری سمجھ اگر مجھ سے یہ کہتی ہے کہ میں پنجوں پر گھومتے ہوئے سُرخ کپڑا پوری طرح نہ سمیٹوں تو مجھے اس کا حق حاصل ہے۔ جس فن میں مَیں اپنی ذات کا اظہار نہیں کر سکتا اُسے مَیں فن ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ اب ہم نئے بُل فائٹر اسکول کے بچّوں کی مانند سبق رَٹ کر طوطوں کی طرح فر فر نہیں سُنا سکتے۔ اب یہ فن یا تو ہماری ذات کے اظہار کا ذریعہ بنے گا یا ختم ہو جائے گا۔ ہم اسے نئی بنیادوں پر استوار کریں گے۔"

"اور اسی لیے تم کبھی بھی ایک نامور بُل فائٹر نہیں بن سکتے۔" پادرو کا چہرہ اب پتّھر تھا۔

"آل کوردیس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس نے بُل فائٹنگ کے تمام مرّوجہ اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے اور وُہ اس پوری دُنیا میں عظیم ترین بُل فائٹر مانا جاتا ہے۔"

"وُہ بھانڈ......" پادرو اگر شراب خانے سے باہر ہوتا تو یقیناً نفرت سے تھوک دیتا۔ "وُہ فائٹر نہیں مداری ہے جو صرف اپنی شخصیت سے لوگوں کو متاثر کر لیتا ہے۔ آج تک کسی جیّد نقّاد نے اس کے فن کی تعریف نہیں کی......"

"دُنیا کے لاکھوں لوگ اس کے فن کی تعریف......"

"لوگ کیا ہوتے ہیں انتونیو" پادرو کا بھاری جسم غصّے سے کانپنے لگا۔ "فن کی قدردانی صرف وُہی ماہر کر سکتے ہیں جو اس کے قاعدوں سے آگاہ ہوں۔ لوگ؟ ہونہہ اَن پڑھ دیہاتی جن کی نظریں فن کی باریکیوں کی بجائے بُل فائٹر کے شوخ لباس اور بکھرے ہوئے بالوں کو دیکھتی ہیں۔ جنھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ باندریلو کی برچھیاں گاڑتے وقت بُل فائٹر کو جھکنا نہیں چاہیئے۔ ایک مرتبہ جب میں نے ولنسیہ کی ایک بُل فائٹ میں باندریلو گاڑیں تو......"

انتونیو بے اختیار ہنسنے لگا۔ یہ شخص ایک نڈر نقّاد تو نہیں۔ یہ تو صرف ایک خوف زدہ آدمی ہے۔ ایک ماضی پرست کھوکھلا انسان جو ہر اس تبدیلی سے خائف ہے جو اس کے بڑے سَر میں اٹکے ہوئے چھوٹے سے ذہن میں نہیں آتی۔ جو سہما ہُوا ہے اس خیال سے کہ کہیں نوجوان نسل کی بے پناہ صلاحیتیں اس کے عامیانہ ماضی کے کھنڈر کو بھی ایک چٹیل میدان میں نہ بدل ڈالیں اور اسی لیے وُہ ایک بندر کی طرح اپنے ہاتھ میں آئے ہوئے اُسترے کو اپنی خود ساختہ عظمتوں کے دفاع کے لیے بے دریغ استعمال کرتا ہے ــ ایک قابلِ رحم شخص جو اگر اپنے محدود تجربے کی روشنی سے نئے بُل فائٹروں کو راہ دکھاتا تو قابلِ عزّت ٹھہرتا۔

"پادرو......" انتونیو نے نہایت اطمینان سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بلاشُبہ آپ نے آج سے پچیس برس پیشتر ولنسیہ میں بہترین بُل فائٹنگ کا

مظاہرہ کیا ہوگا مگر وہ سمے بیت گئے۔"

پادرو نے سر جھکا لیا۔ اُس کی آواز میں ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا۔

"نہیں انتونیو! عظیم عمارتوں کی بنیاد صرف ایک مرتبہ رکھی جاتی ہے۔ اس میں بار بار ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی شراب خانے کے دروازے میں سے تمھیں ایک ایسی چار دیواری نظر آ رہی ہے جس کے درمیان گئے وقتوں میں رُومیوں کا ہیکل تھا' پھر اُسے ڈھا کر گوتھوں نے اپنا مندر بنایا۔ عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہُوا تو اُنھوں نے اسی کی بنیادوں پر سینٹ ونسنٹ کا کلیسا تعمیر کیا۔ پھر افریقہ سے مور آ گئے اُنھوں نے یہیں انھی بنیادوں پر مسجد قرطبہ کے ستون اُٹھائے۔ عیسائی واپس آئے تو اس مسجد کو کلیسا میں بدل دیا۔ بنیاد وہی رہی مگر اس پر متعدد عظیم عمارتیں اُٹھتی رہیں۔"

"مگر ان تمام عمارتوں کے معماروں نے ہر محراب، ہر ستون، ہر چیپل میں اپنی ذات کا اظہار کیا۔" انتونیو جوش سے کہہ رہا تھا۔ "اگر ذات کا اظہار مقصود نہ ہوتا تو یہاں آج بھی رُومیوں کا ہیکل ہی نظر آتا۔ اسی طرح ہم نہیں چاہتے کہ بُل فائٹنگ کا مقدس معبد آج سے پچاس برس پہلے کی صورت میں کھڑا نظر آئے۔ ہمارے جیسے نئے عقیدے کے لوگ چاہتے ہیں کہ اس کی جگہ پہلے سے بھی خوبصورت اور بہتر عمارت اُبھرے۔ جیسے ...... جیسے بھدّے سینٹ ونسنٹ کے کلیسا کی بنیادوں پر مسجد قرطبہ کے ستونوں کے جنگل اُٹھے اور اپنے اندر اظہار کی خوبصورتی سمیٹ لی......"

"تم سے بحث فضول ہے،" پادرو اپنے بھاری بھرکم جسم کو بمشکل حرکت میں لا کر اُٹھ بیٹھا۔ "لیکن جب تک میرے قلم میں طاقت ہے میں بُل فائٹنگ کے اکھاڑے کی ریت کو تم جیسے نوآموز اور اپنی ذات میں گم بُل فائٹروں کے ناپاک قدموں سے آلودہ نہیں ہونے دُوں گا۔" اور شراب خانے سے باہر چلا گیا ــــ

بُل فائٹنگ کے کالم نگار ہسپانیہ میں بے حد اثر و رسوخ کے مالک ہوتے ہیں۔

ان کے قلم سے نکلا ہُوا ایک لفظ کسی گمنام درمیانے درجے کے بُل فائٹر کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے یا کسی ہنرمند نوجوان کو تباہی کے غار میں دھکیل سکتا ہے۔ کسی غیر معروف اکھاڑے میں اگر ایک نوجوان بُل فائٹر فن کی بلندیوں کو چھو بھی لے تو کیا۔ ہزاروں تماشائیوں کی داد فائٹ ختم ہوتے ہی بے سُود اور اس کے بعد کالم نگار کی ایک سطر اس مدح پر حاوی ــــ خاص طور پر بڑے شہروں میں تو کسی بُل فائٹر کے مقام کا تعین صرف کالموں سے پرکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ صلاحیت کا بادبانی جہاز اپنی جگہ مگر یہ جہاز تب تک شہرت کے سمندروں میں رواں نہیں ہوتا جب تک اُس کے بادبانوں میں تعلقاتِ عامہ کی ہَوا نہ بھری جائے۔ چنانچہ بُل فائٹنگ کا کالم نگار ایک بلیک میلر کی طرح انتہائی آرام دہ زندگی گزارتا ہے۔

حسبِ توقع پادرو کا کالم چھپتے ہی بُل فائٹنگ کے مرکزی اداروں نے انتونیو کے وہ تمام معاہدے منسوخ کر دیئے جن کے تحت اسے ملک بھر میں اپنے فن کے جوہر دکھانے تھے۔ کسی دوسرے شہر میں تو کجا انتونیو کے لیے قرطبہ کے بُل رنگ میں بھی داخلہ ناممکن ہو گیا۔ آخر پادرو اپنے کالم میں قرطبہ کے بُل رنگ کے کرتا دھرتا لوگوں کو بھی تو رگید سکتا تھا۔

دن گذرتے گئے اور انتونیو اپنے باپ کی ورکشاپ میں بیٹھا کُڑھتا رہا۔ اب اُس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وُہ چند لمحوں کے لیے "بار سکینا" میں ہی جا کر بیٹھ سکے۔ بالآخر مئی کا مہینہ آیا جس کے پہلے ہفتے میں سالانہ "فِی استا" منعقد ہوتا ہے۔ رقص و موسیقی کے اس جشن کا اختتام قرطبہ کے بُل رنگ میں ہوتا ہے جہاں نوآموز قسم کے بُل فائٹر لوگوں کی تفریحِ طبع کی خاطر کھیل میں حصّہ لیتے ہیں۔ ایک شام جب انتونیو اپنے پاتیو کی دیواروں پر ٹنگے پھولوں کے گملوں کو پانی دے رہا تھا میونسپل کارپوریشن کے ہرکارے نے اس کے ہاتھ میں جشن کے آخری روز کی بُل فائٹ میں شامل ہونے کا دعوت نامہ تھما دیا۔ یہ کارستانی یقیناً کسی ایسے کلرک کی تھی جس کے مخمور ذہن سے دعوت نامے جاری کرتے وقت پادرو کا کالم اُتر گیا تھا۔

بُل رنگ کے درمیان میں ایک بَونا مسخرہ سُرخ کپڑے پہنے ایک مریل سے بُل کے آگے قلا بازیاں لگا رہا تھا اور نشے میں چُور بے فکرے تماشائیوں نے آسمان سر پہ اُٹھا رکھا تھا۔ انتونیو گیلری پر کُہنیاں ٹکائے بُل فائٹ کے روائتی لباس میں ملبوس اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ایسی بُل فائٹ میں حصہ لینا اُس جیسے باکمال بُل فائٹر کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس پُرشور ہجوم میں کوئی شخص بھی بُل فائٹنگ میں دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ وہ یہاں صرف شراب نوشی کرنے، چیخنے چلّانے اور گالیاں بکنے کے لیے آئے تھے۔

"امیگو" مسخرہ اکھاڑے سے باہر آ کر انتونیو کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی مخروطی ٹوپی اُس کے سر پر جما دی "اب تم لوگوں کو ہنساؤ" اِردگرد بیٹھے مخمور تماشائی بے تحاشا ہنسنے لگے۔ انتونیو نے انتہائی بے بسی کے عالم میں ان کی جانب دیکھا۔ پھر مخروطی ٹوپی سر سے اُتار کر سُرخ کپڑا ہاتھ میں تھامے چپکے سے اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے کسی کو ذرہ برابر پرواہ نہ تھی کہ اکھاڑے کے اندر کھڑا بُل فائٹر کون ہے؟ زندگی میں پہلی مرتبہ انتونیو تالیوں کی گونج کے بغیر بُل رنگ میں داخل ہوا تھا۔ پادرو حسبِ معمول اپنی مخصوص کیبن میں بُت بنا بیٹھا تھا۔ اس دوران بگل بجا اور بڈھے کارلوس نے سُرخ پھاٹک کھول دیا۔ انتونیو نے اپنی جیکٹ درست کی۔ تن کر کھڑا ہوا، اور پوری طرح مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ سُرخ پھاٹک میں سے نکلتے ہی بُل نے اکھاڑے کا ایک چکر اس شانِ بے نیازی سے لگایا جیسے اُسے بُل فائٹر کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ ہو۔ اِس پر اکثر لوگ قہقہے لگانے لگے۔

"مسخرے کی ٹوپی پہن لیتے تو بُل ضرور متوجہ ہو جاتا" انتونیو پر آوازے کسے گئے۔

"ہے ہے" سُرخ کپڑا پھیلاتے ہوئے انتونیو نے للکارا ــ بُل نے اپنی موٹی گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور پھر گیلری کے ساتھ لگ کر یُوں کھڑا ہو گیا جیسے اس کا لڑنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ تماشائیوں کے تحقیر آمیز قہقہے اور سیٹیاں انتونیو کے جسم میں تیروں کی طرح پیوست ہو گئے۔ مسخرے نے پھر اپنی ٹوپی اتار کر انتونیو کے قدموں میں پھینک دی۔

"پہن لو۔ پہن لو" نعرے لگنے لگے۔

انتونیو نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کپڑا تھام رکھا تھا ورنہ وہ اپنی آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی کو پونچھتا جس میں سے بُل اُسے ایک دُھندلائے ہوئے خواب کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا گیلری کے نزدیک آیا اور سُرخ کپڑا بُل کے آگے بچھا دیا۔ بُل نے اپنی تھوتھنی کپڑے پر رکھ کر اُسے سُونگھا۔ انتونیو نے کپڑے کو بہت آہستہ سے اپنی جانب کھینچا۔ بُل اُس پر تھوتھنی رکھے چند قدم آگے آ گیا۔ پھر انتونیو بتدریج کپڑا گھسیٹتا گیا اور بُل اُسے سُونگھتا اس کے پیچھے پیچھے چلتا آیا۔ میدان کے درمیان میں پہنچ کر انتونیو نے سُرخ کپڑا ایک جھٹکے سے اُٹھا لیا۔ اپنے آگے بچھے ہوئے کپڑوں کو یُوں چشم زدن میں غائب دیکھ کر بُل نے سر اُٹھایا تو سامنے انتونیو کھڑا تھا۔ گیلری کے پیچھے بیٹھے ہوئے چند لوگ کھیل کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"ہو ہے" بُل کے آگے سُرخ کپڑا لہراتے ہوئے انتونیو نے بڑے اطمینان سے کہا۔

بُل جسے اس کی مرضی کے خلاف دھوکے سے میدان میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔ ایک دم پھنکارتا ہُوا حملہ آور ہو گیا۔ اس کے سینگ جب انتونیو کے سینے پر دستک دینے کو تھے تو اُس نے فوراً سُرخ کپڑا سمیٹ لیا۔ بُل اپنے مومنٹم میں بھاگتا ہُوا دُور نکل گیا۔ تماشائیوں کی اکثریت اب اُس بُل فائٹر کی جانب متوجہ ہو گئی جو ایک بزدل بُل کو کمال چابکدستی سے میدان میں گھیر لایا تھا۔ بُل دوسری مرتبہ حملے کے لیے دوڑتا آیا تو انتونیو اس انداز میں گھوما کہ سُرخ کپڑا ایک لبادے کی صورت میں اُس کے جسم سے لپٹ گیا اور بُل کا بھاری بھرکم بدن اس کے پیٹ کو چھُوتا ہُوا نکل گیا۔ یہ دونوں انداز کلاسیکی روایات کے عین مطابق تھے اور ان میں ذاتی اظہار کا شائبہ تک نہ تھا۔ نپی تُلی جامد روائتی کا انداز۔ انتونیو نے جیسے تماشائیوں پر جادو پھُونک دیا ہو وہ خمار کی حالت سے نکل کر اپنی نشست پر اکڑوں بیٹھے بے تحاشا تالیاں پیٹ رہے تھے۔ پادرو کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اب انتونیو خطرناک حد تک بُل کے نزدیک چلا گیا۔ بُل نے سر اُٹھایا تو انتونیو نے سُرخ کپڑا تان کر آہستہ سے جھٹکا۔ جونہی بُل حملہ آور ہونے لگا، انتونیو نے اتنی چابکدستی سے کپڑے کو کھینچ کر گھما دیا کہ بُل متذبذب ہو کر اگلی ٹانگوں پر گرتے گرتے بچا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انداز سے بُل کو گرا لینا کلاسیکی بُل فائٹنگ کی معراج ہوتا ہے۔

تمام تماشائی نشستوں پر کھڑے تالیاں بجا بجا کر داد دے رہے تھے۔ عورتوں کے آنسو تھمنے میں نہ آ رہے تھے اور وہ فرطِ مسرّت سے مغلوب ہو کر بالوں میں لگے چنبیلی کے پھول اُتار کر اکھاڑے میں پھینک رہی تھیں۔ مردوں نے عقیدت کا اظہار میدان میں اپنی گھڑیاں، بٹوے، رُومال اور مشکیزے پھینک کر کیا۔ موسیقاروں کا طائفہ بڑے زور شور سے "بولیرو" کی دُھن بجا رہا تھا۔

"تم نے کلاسیکی روائت کو پھر سے زندہ کر دیا ہے میرے بیٹے" پادرو بھی اپنی نشست پر کھڑا چیخ رہا تھا۔

انتونیو جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔ تماشائیوں کے نعروں کے جواب میں ہاتھ تک نہ ہلایا۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔ گُم سُم!

بُل اب ایک مرتبہ پھر اکھاڑے کے مرکز سے دُور گیری کے ساتھ پشت لگائے کھڑا تھا، مگر بھاگنے کی نیت سے نہیں، بلکہ اپنی پُوری قوّت سے دوڑ کر حملہ آور ہونے کے لیے۔

"ہے تورو" انتونیو نے سُرخ کپڑا جھٹکا "آؤ میرے پاس آؤ"

بُل رِنگ پر سکُوت طاری ہو گیا۔ آج سے چھ ماہ پیشتر کی اُس شب کی طرح جب پچھلے پہر کی مدھم چاندنی میں یہ ایک قدیم یُونانی تھیٹر کا کھنڈر لگ رہا تھا۔ ہر سُو خاموشی تھی۔ اِس سکوت میں ایک مرتبہ پھر انتونیو کی مردانہ آواز گونجی۔

"ہے تورو"——————

بُل نے اپنے سے بیس گز دُور ساکت کھڑے انسانی جسم کو چمکتی آنکھوں سے جانچا اور پھر اُس کے پھیلائے ہوئے کپڑے کی جانب بے تحاشا دوڑنے لگا۔

انتونیو نے اپنے پیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے نوکدار سینگوں کو دیکھا۔ جب دونوں کے درمیان صرف پانچ گز کا فاصلہ رہ گیا تو انتونیو نے ایک دم سُرخ کپڑا گھما کر دُور پھینک دیا اور دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے یُوں کھڑا ہو گیا جیسے وُہ بُل کو آغوش میں لے لینا چاہتا ہو۔

"آجاؤ" وُہ زور سے چیخا اور اُسی لمحے بُل کے تیز سینگ انتونیو کی سُنہری جیکٹ کو پھاڑتے اُس کی چھاتی میں پیوست ہو گئے——————

گیس چیمبر

مجھے زندہ رہنے کے لیے تین چیزیں درکار ہیں۔ ہوا، دُودھ اور نیند۔

جب وہ مجھے ہسپتال سے لائے تو ابھی میری آنکھیں بند تھیں۔ پپوٹوں سے پرے مناظر پھیلے ہوں گے جو میں پہلی مرتبہ دیکھوں گا۔ مناظر ہونے چاہئیں۔ اگر نہ ہوئے تو میری کھوپڑی میں ان دو چھیدوں کی کیا ضرورت تھی۔؟

سُنا ہے یہ منظر، یہ شبیہیں خوبصورت ہیں مگر مجھے تو پچھلے دس روز سے یہ دکھائی نہیں دیئے۔ صرف ایک آبی پردہ ہے میرے اور اُن کے درمیان۔ اِس آبی پردے اور ایک متواتر جلن کے پیچھے کچھ چیزیں حرکت کرتی ہیں۔ جاندار اور بے جان۔ گھٹیا آئینے میں ڈوبتے، اُبھرتے، غیر واضح عکس۔ منظر کبھی صاف نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے اِس دُنیا میں منظر ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہوں۔

بقیہ جسم کی طرح میرے پپوٹے بھی کچّا آٹا ہیں، نرم نرم گُودا۔ بچّے کا جسم کیا ہوتا ہے؟ کچّے گوشت اور حیات آور پانیوں کا گُندھا ہوا مرکب۔ آہستہ آہستہ

غیر ضروری پانی خشک ہوتا ہے تو گوشت سخت ہو کر جڑیں پکڑنے لگتا ہے، مگر ابھی نہیں......

میں جب سے یہاں آیا ہوں میرے پپوٹے جلن کی سلائی مشین کے نیچے آئے ہوئے ہیں۔ اِنھیں جلن ڈستی رہتی ہے، جلن کی سُوئی اِن پر کشیدہ کاری کرتی رہتی ہے۔ جلن کے ہاتھ نقش و نگار کُریدتے رہتے ہیں۔ نقوش کے یہ چُبھتے نیزے پپوٹوں کے گُودوں کو چھید کر میری آنکھوں میں دھنس جاتے ہیں اور اُن میں سے پانی رِسنے لگتا ہے۔ پانی، آنسو، اشک، ٹیئر۔ مگر میں تو اِن پپوٹوں کو کھول کر اِن کے سامنے بکھرے مناظر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ شبیہوں سے دوستی کرنا چاہتا ہوں اور یہ کُھلنے سے اِنکاری ہیں۔ کہیں میں اندھا تو نہیں ہوں؟ یہ بات بھی میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا، جو آنکھوں کے سامنے پردے پڑے رہیں، کسی شے نے حرکت نہ کی ہو، وُہ اندھی تو نہ ہوئیں۔ ہاں حرکت دیکھنے کے بعد ہو جائیں تو!

بہرحال ایک روز میں نے ہمّت کر کے جلن کی یلغار کے باوجود پپوٹے اُٹھا دیئے۔ ایک آبی پردے کے پیچھے چند شبیہیں حرکت میں تھیں، مگر وُہ خوبصورت مناظر کہاں تھے جن کے لیے مجھے اِس دُنیا میں بھیجا گیا تھا؟ میں ان غیر واضح شبیہوں کے لیے بھی زیادہ دیر تک پپوٹے نہ کھول سکا کہ ہوا میں شامل گیس کی کاٹ میری آنکھوں کو یُوں چھید رہی تھی جیسے ایک اناڑی جرّاح گہرا زخم کھودتا ہے اِس لیے میں اب اپنی آنکھیں بند ہی رکھتا ہوں۔ کبھی کبھار کھولتا ہوں۔

میرے گرد کی ہوا میں گیس ہے۔

ماں کے پیٹ میں بھی میں سانس لینے کے عمل سے ناواقف تھا اگرچہ لیتا تھا مگر ناواقف تھا کہ یہ اس نرماہٹ سے میرے بدن میں چلتا تھا جیسے اُونچے درختوں کی چوٹیوں کو ہوا چھُوتی جاتی ہے مگر تنے کو خبر تک نہیں ہوتی۔ میں بدن کے تنے میں کروٹیں بدل کر باہر آنے کی خواہش کا اظہار کرتا تھا۔ اور جب باہر آنے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے منہ کھولا، پھیپھڑے بھینچ کر ہوا کو اندر کھینچا تو ہوا کے ساتھ ساتھ دہکتے ہوئے ذرّے بھی مجھ میں داخل ہو گئے۔ اب میں اذیت سے

بچاؤ کی خاطر صرف اُس وقت سانس لیتا ہوں جب میرا مُنہ کُتّا پھول کی طرح خود بخود کھل جاتا ہے اور جوں ہی سانس لینے کی نالی پر گیس کے آرے چلتے ہیں پھر بند ہو جاتا ہے۔ میں دن رات سانس لینے کا جتن کرتا ہوں۔ میرے گرد تازہ ہوا کیوں نہیں؟

گلیوں، بازاروں، چوراہوں میں اشک آور گیس چھوڑنے کا مقصد جانے کیا ہے؟ شاید وہ اِس دُنیا میں آنے والی ہر نئی زندگی، ہر نئے خیال کا دم گھونٹ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے سفید دھوئیں میں لپیٹ کر دفن کر دینا چاہتے ہیں...... کہیں میں دنیا کی بجائے کسی گیس چیمبر میں تو پیدا نہیں ہو گیا۔ ایک ایسا گیس چیمبر کہ میرے گرد، میری آنکھوں سے نا آشنا پورے معاشرے پر محیط ہے، جہاں میری طرح سب لوگ رُک رُک کر زہر نگلتے سانس لیتے ہیں۔

دُودھ والا بھی کئی روز سے نہیں آیا۔ باہر کرفیو ہے۔

میری ماں کی چھاتیوں میں دُودھ خشک ہو چکا ہے مگر گوالوں کی بھینسوں کے تھن اس سے بھرے ہوتے ہیں۔ لیکن دُودھ والا تو کئی روز سے نہیں آیا۔ وُہ مجھے ڈبے کا دُودھ پلاتے ہیں جسے میں پھول پھول کر بیتا رہتا ہوں اور میرے اندر کائی جمتی چلی جاتی ہے۔

میرے گرد کی ہوا میں گیس ہے۔ دُودھ والا کئی روز سے نہیں آیا اور نیند؟

پہلے پہل میں خفیف سی انسانی آواز سن کر بھی چونک جاتا۔ میرے سرہانے کوئی بلند آواز سے بات کرتا تو میرا جسم یکدم تھرتھرانے لگتا اور میں خوفزدہ ہو کر بازو اور ٹانگیں ہوا میں معلق کر دیتا (اگرچہ اب تو میری خواہش ہے کہ انسانی منہ سے نکلے ہوئے تیز الفاظ بے شک میرے کانوں کے پردے چیر ڈالیں لیکن انسانی ہاتھوں کے تخلیق کردہ دھماکے، وہ میں نہیں چاہتا) تو میں کہہ رہا تھا کہ پہلے میں انسانی آوازوں سے بھی کانپ کانپ جاتا تھا مگر اب ان کے ہمراہ میرے زول مجھے کو جھنجھوڑ دینے والی، کاٹ دینے والی، ریزہ ریزہ کر دینے والی آوازیں بھی شامل ہیں۔ کچھ رُک رُک کر چلتی ہیں مگر ایک تسلسل کے ساتھ...... ٹِک ٹِک ہِک ٹکا ٹِک۔

ادھر کچھ ایک ہی مرتبہ دھم سے پھٹ پڑتی ہیں۔ کیا وہ اُنگلی جو لبلبی پر جمی ہے نہیں جانتی کہ بچے کے سرہانے شور نہیں کرنا چاہیئے؟

یہ شور اُنھیں بھی خوفزدہ کرتا ہے جو میرے سرہانے کھڑے ہوتے ہیں کہ اِسے پیدا کرنے والے اُنہی کے بھائی بند ہیں جو گلیوں، چوراہوں اور بازاروں میں یوں گھومتے ہیں جیسے کسی مفتوحہ علاقے میں گشت کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی مجبور ہوں، ہو سکتا ہے نہ بھی ہوں۔ یہ تو صرف اُنھیں معلوم ہے کہ وہ ہیں یا نہیں۔ جن سڑکوں پر بچوں کی گیندیں لُڑھکتی تھیں وہاں خاردار تار کے گولے حرکت کرتے ہیں، ٹیئر گیس کے گولے پھٹتے ہیں۔ میں اپنے اِردگرد ہونے والی باتیں سمجھتا ہوں۔ چہروں کی پہچان رکھتا ہوں، اگرچہ وُہ نہیں جانتے۔ میرے سرہانے کھڑے لوگ اب تک سنگل فائر سٹین گن کے ریپڈ فائر، شادی والے گولے سے دھماکے اور ٹیئر گیس شیل کے پھٹنے کی آوازوں کا بھید پا چکے ہیں۔ سنگل فائر ٹین کی چھت۔ ریپڈ فائر اگی کے دانے بھٹی میں تڑاخ تڑاخ اچھل رہے ہیں۔ شادی کا گولا! کانوں کے پردوں تک پہنچتے پہنچتے یک دم ٹھنڈا ہو کر ٹھُس ہو جانے والا دھماکا اور ٹیئر گیس شیل سفید دھواں چھوڑتی تیرتی ہوئی شُرلی۔ مگر مجھے اُن میں سے کسی دھماکے کی بھی پہچان نہیں ہو سکی۔ میرے لیے تمام دھماکے کی بھی پہچان نہیں ہو سکی۔ میرے لیے تمام دھماکے ایک سے ہیں۔ مجھے سونے نہیں دیتے!

اکثر اوقات جب شور کے جبڑے مجھے بے رحمی سے چباتے لگتے ہیں۔ چہرہ اور حلق گیس کی سُولوں سے چھلنی ہو رہا ہوتا ہے۔ پیٹ میں تہ در تہ جما پاؤڈر چٹکیاں لیتا ہے تو میں احتجاج کرنے کے لیے بازو اور ٹانگیں زور زور سے ہلانے لگتا ہوں۔ مگر وہ سمجھتے ہیں کہ میں کھیل رہا ہوں اور خوش ہوتے ہیں۔ مجھے تو احتجاج کا یہی طریقہ آتا ہے۔ میں ابھی اس طریقے سے واقف نہیں ہُوا جو باہر سڑکوں پر جاری ہے۔

وُہ ساتھ والے کمرے میں چیختے ٹیلیویژن پر احکام سُنتے رہتے ہیں۔ کرفیو میں نرمی کے اوقات تخریب کی صورت میں پورے محلے کے لیے سزا...... کرفیو کُھلتا ہے تو وُہ سب بھیڑ بکریوں کی طرح گھر سے باہر نکل جاتے ہیں، تازہ ہوا میں سانس

لینے کی خاطر۔ جیسے قیدی قید سے چھوٹ جائے، ضمانت پر رہا ہو جائے۔ مگر مجھے فراموش کر دیتے ہیں۔ ساتھ نہیں لے جاتے اور میں اُسی زہر آلود ہوا میں سانس لینے کا چارہ کرتا رہتا ہوں۔

گیس ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ گیلے رومال سے اپنی آنکھیں ڈھانپنے لگتے ہیں مگر میری جانب کوئی نہیں دیکھتا۔ میں کئی مرتبہ کھانسا بھی، مجھے اس معاشرے میں جلن سے بچنے کے لیے ایک چھوٹا سا گیلا رومال دے دو!

کرفیو کے دوران جب وہ تاش کھیل کھیل کر تنگ آ جاتے ہیں تو پھر میرے گرد ہو جاتے ہیں۔ ہشی ہشی کرتے ہیں اور میرے لبوں کو بار بار چھوتے ہیں۔ مجھ سے مسکراہٹ مانگتے ہیں۔ میں کیسے مسکراؤں کہ لب کھولنے سے گیس اندر جاتی ہے۔

میرا اندر جس میں ڈبے کے دودھ کا لیپ دبیز ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ زبردستی میرے لب کھول دیتے ہیں۔ میں کھانسنے لگتا ہوں۔ درد کی شدت سے میرے لب سکڑتے ہیں اور ہلنے لگتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں میں مسکرا رہا ہوں۔ شاید اِس دُنیا میں اکثر لوگ اسی طور مسکراتے ہیں۔

ریڈیو پر اعلان ہوا ہے کہ ٹیئر گیس شیل ختم ہو گئے ہیں۔ شاید اب میں آسانی سے سانس لے سکوں۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں کہ تازہ ہوا کیا ہوتی ہے۔ ہوتی ہوگی۔ جب اُس میں سانس لوں گا تب مانوں گا۔ سنی سنائی بات کا کیا اعتبار؟ کیونکہ یہاں پر ہر بات سنائی تو دیتی ہے مگر اصل میں ہوتی نہیں۔

مجھے ابھی تک اپنی صنف کا علم نہیں کہ میرا نام نہیں رکھا گیا۔ وہ کہتے ہیں حالات ٹھیک ہو جائیں گے پھر رکھیں گے۔

ہر اُس بچے کی طرح جو اِس دنیا میں آتا ہے میں بھی پیدائش کے وقت رو رہا تھا، مگر میری وجوہات قدرے مختلف تھیں۔ نو ماہ کے سکون کے بعد میں یکدم دھماکوں کی تاب نہ لا سکا۔ اِس لیے شاید اُس وقت بھی دھماکے ہو رہے ہوں گے جب میں ماں کے پیٹ میں پُرسکون لیٹا تھا مگر وہاں ان کی آواز مجھ

تک نہیں پہنچ پائی۔ ویسے کوئی نہ کوئی ایسا سسٹم ضرور ہونا چاہیے کہ جس سے باہر کی صورتِ حال کا پتہ چلتا رہے۔ حالات مناسب ہوں تو بچہ پیدا ہو جائے ورنہ اِنکار کر دے، وہیں لیٹا رہے مزے سے۔

یہ شور کبھی ختم نہ ہوگا؟ ہوا گیس سے بوجھل ہی رہے گی؟ دودھ والا کبھی اِدھر نہ آئے گا؟ مجھے یہاں رہنے کا بالکل چاؤ نہیں۔ کاش میں واپس اپنی ماں کے بدن میں جا سکتا، وہاں سکون تھا۔ اب میرا کومل کچا جسم اُس طویل اذیت کا جسے زندگی کہتے ہیں متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس میں میرا تو قصور نہیں، صرف اُن لوگوں کا ہے جنھوں نے مجھے پیدا کیا اور اس سے پیشتر ہوا کو صاف اور تازہ رکھنے کا جتن نہیں کیا۔ شور کا گلا نہیں گھونٹا۔ میرے لیے دودھ کا انتظام نہیں کیا۔

مجھے زندہ رہنے کے لیے تین چیزیں درکار ہیں۔ ہوا، دودھ اور نیند۔

اگر یہ اس چار چیزے میں میسّر نہیں تو میں کیا کروں گا یہاں رہ کر۔ شاید بڑے ہونے پر ان تین چیزوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی مگر میں بڑا کیسے ہوں گا؟ اور اگر ہو بھی گیا تو کیا کروں گا بڑا ہو کر کہ نرے گیس کے غبارے دیکھ کر ہی میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں اُس دودھ کو نہیں پیوں گا جو میرے اندر تہیں بچھا رہا ہے۔ سو میں سکتا نہیں۔ ہاں میں اب ہوا میں ضرور لمبے لمبے سانس لوں گا تاکہ جب وہ واپس آئیں تو انھیں میرے دودھ کی فکر نہ ہو۔ لمبے لمبے سانس۔!

ایک سگریٹ ایش ٹرے میں دھرا ہے۔ اُس میں سے دھواں چھوٹ رہا ہے۔ سڑک پر پڑے ٹیئر گیس کے گولے میں سے اسی طرح آہستہ آہستہ دھواں اُٹھتا ہوگا۔

لوہے کا کُتّا

ہمارے اُوپر چھاؤں ہو رہی ہے۔
کھڑکتے خالی ٹین نعروں، نظاموں کا ایک ٹڈی دل ہمارے سر سبز کھیتوں پر بیٹھ رہا ہے۔
پودوں، پتّوں، کونپلوں کی شکلیں مدھم ہو رہی ہیں۔
ہر بادل ٹڈیوں کے اتھاہ پیٹ میں منتقل ہو رہی ہے۔
سب کچھ پردۂ فنا میں رُوپوش ہونے کو ہے۔
دیکھو، وُہ اِس کنوئیں کے کانجن پر، پاڑچھے اور ڈھول پر، ٹنڈوں اور ماہل پر بیٹھ رہا ہے۔
سبزے کی نرمی کے بعد وُہ لکڑی اور لوہے کی سختی بھی اپنے شکم میں اُتارے گا۔
دیکھو اب وُہ ہماری ننگی پیٹھوں، مضبوط بازوؤں پر بھی تہ در تہ جم رہا ہے۔
تُم اِسے اُڑا نہیں سکتے۔؟
(یا پھر ہمیں مہلت دو)

بدن، پکھر سالوں کا سَم سمیٹے، بُجھتے ہوئے اور کچھ نوجوانی کی چمک سے روشن، توانا، ایک کنوئیں کی پنجالی میں جُتے زور لگا رہے ہیں، اُسے گیڑ رہے ہیں جنوروں کی جگہ۔ اُن کے بوڑھے اور جوان پٹھے کھنچ رہے ہیں۔ بیڑ پر لدی ٹنڈیں سبزے کی ابتداء پانی کو گہرائیوں میں سے کھینچ کر باہر لا رہی ہیں۔ نثار میں سے گذر کر سر سراتا پانی اُدلوپیں گرتا ہے اور نال میں بہتا کھیتوں میں جا جذب ہوتا ہے۔
بدن، درمیان میں گڑے تیر کے چار چفیرے ایک مشقتی دائرے میں گھوم رہے ہیں، زور لگاتے محنتوں کے پسینے سے تر۔ وہ سانس درست کرنے کے لیے بھی رُک نہیں سکتے کہ وہ ہمیشہ سے اس پنجالی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر اُن کے پیچھے، اُن کی ننگی پیٹھوں کے پیچھے، گادھی پر اِس سے پیشتر اُن کے احساسِ فرض کے سوا اور کوئی بوجھ نہ تھا۔
مگر اب وہاں گادھی پر، اُن کی ننگی پیٹھوں کے پیچھے ایک اور جسم تھا۔ لشکتے دانتوں والا، زہر آلود تھوک اُگلتا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں شیشم کی ایک پتلی ڈالی، ایک چھمک تھی جو بدنوں پر لگاتار برستی تھی۔ چھمک کے پہلے وار پر اُنھوں نے حیرت سے رُک کر پیچھے دیکھا کہ احساسِ فرض کے بوجھ کو کس نے ہٹا کر وہاں اپنا بوجھ ڈال دیا مگر اُن کی گردنوں کے گرد پنجالی کسی گئی اور اُنھیں معلوم ہو گیا کہ وُہ مُڑ کر دیکھ نہیں سکتے اور وُہ رُک بھی نہیں سکتے تھے۔
ہم ہمیشہ سے اس پنجالی میں جُتے ہوئے ہیں۔
ہم من مرضی سے مشقتی بنے ہوئے ہیں کہ سبز ساعتوں کو ابدیت حاصل ہو۔
ایک ایسی شب جب ہمارے پیچھے گادھی پر احساسِ فرض کے سوا کوئی بوجھ نہ تھا کہ کسی نے چوری چھپے چھکی کے پہیے کو گرفت میں لینے والے لوہے کے کُتّے، یعنی دانت کو علیحدہ کر دیا۔ ہمیں تو صرف اُس وقت خبر ہوئی جب ہم سانس درست کرنے کی خاطر رُکے اور یکدم پنجالی ہماری گردنوں کے گرد کس گئی۔ ہمارے پاؤں زمین پر سے اُکھڑنے لگے کہ آہنی کُتّے کی غیر موجودگی میں چکلی کے پہیے کو روکنے والی کوئی شے نہ تھی۔

اور چکلی کے اوپر بوجھ ہوتا ہے پانی سے بھری ٹنڈوں کا اور یہ بوجھ ہمیں اُلٹے قدموں جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہمارے بدنوں کو واپس کھینچ رہا تھا۔ ہم نے پہلے جھٹکے کے بعد پنجالی کو سنبھال لیا۔ ورنہ ایک اُلٹا چکر شروع ہو جاتا اور رہاٹ مخالف سمت میں گھوم جاتی اور بھری ہوئی ٹنڈیں واپس کنوئیں میں جا گرتیں۔ پانی ختم جاتا مگر ہم ڈٹے رہے۔ ہم نے ایک حیوانی قوت کو بروئے کار لا کر پھر سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ کنوئیں کو گیڑنا شروع کر دیا اور اُسی لمحے ہمارے جسموں پر تمھاری چھمک کا پہلا وار ہُوا۔ تم کھیتوں کی رکھوالی کرنے کی بجائے گادھی پر بیٹھے ہوئے تھے ہمارے مالک بن کر۔

ہم اس دھرتی کے جنور ہیں، ہمیں اس کی خدمت کرنے دو۔

ہم نے تمھیں اپنے کھیتوں کی حفاظت کرنے کے لیے منتخب کیا تاکہ اُن کی منڈیریں ڈھے نہ جائیں، ان میں چوہے اور نیولے سوراخ نہ بنالیں، کوئی شریک پانی کو روک کر اس کا رُخ اپنے کھیتوں کی طرف نہ کر لے۔ تاکہ تم پنگرتی فصلوں کو چڑیوں اور کالے ڈھوڈر کوّوں سے بچائے رکھو۔

تم ہم میں سے ہو مگر ہمارے کامے ہو کر ان کھیتوں میں ہماری مشقتوں سے تن تندور کے لیے جو بالن تیار ہوتا ہے تم بھی تو اُس کے حصّہ دار رہو۔
ہم نے تمھیں اس کا حصہ دار بنایا، خود اپنی من مرضی سے۔ پھر تم ہماری پیٹھ پیچھے چپکے سے آکر گادھی پر کیوں آکر بیٹھ گئے ہو! تمھارے ہاتھوں میں پتلی چھمک کیوں ہے جو ہمارے بدنوں پر برس رہی ہے!

منڈیریں ڈھے رہی ہیں ان کی فکر کرو۔
کماد کو سُوّر نگل رہے ہیں۔
مکّی پر کوّوں کی رکھوالی ہے۔
گندم کی بالیاں چوہوں کے دانتوں تلے ہیں۔
خربوزوں میں گیدڑ بول رہے ہیں۔

اور باجرے کو چڑیاں چُگ رہی ہیں۔

اگر ہم پنجالی میں سے اپنی گردنیں نکال لیں، اس سے علیحدہ ہو جائیں، تو نشست پر تم براجمان ہو وہ جھنجیریاں کھاتی ہوئی چکرانے لگے گی اور یوں تم اپنے آپ کو سنبھال نہ پاؤ گے اور کنوئیں میں جا گرو گے، ہم تم سے نجات حاصل کر لیں گے مگر ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے کہ تم تو ختم ہو جاؤ گے لیکن اس طرح ٹنڈیں ٹوٹ کر کنوئیں میں جا گریں گی اور پانی کا حصول خواب ہو جائے گا، کھیت سُوکھ جائیں گے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم تو سر سبز ساعتوں کو ابدیت رہنے کی جستجو میں جُتے ہوئے ہیں، تمھاری چھمک کے باوجود، آہنی کتے کی غیر موجودگی کے باوجود، تمھاری موجودگی کے باوجود ہم اس پنجالی سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک حد تک......وہ زمانے یاد کرو جب تم اُدھر کھیتوں کی رکھوالی کرتے تھے تو ہمارے ننگے بدن کتنے بے فکر تھے۔ وہ کڑکتی دھوپ میں سیاہ پڑتے اور پالے کے دنوں میں کپکپاتے مگر اب وہ تمام وقت صرف کپکپاتے ہیں، کہ ان کا ماس کیا جانے کہ کب اس پر تمھاری پتلی چھمک سے لاس پڑ جائے۔"

تم ہمیشہ ہمیں لعن طعن کرتے رہتے ہو۔ بھول جاتے ہو کہ ہم ایک اکائی ہیں۔ تمھارے لشکتے دانتوں کے بیچ میں سے ملامت کی تھوک ریچھ کے تیزابی پیشاب کی طرح نکلتی ہے اور ہماری ننگی پیٹھوں کو جلا کر رکھ دیتی ہے اور یوں ہم دل جمعی سے، لاڈ پیار سے اس کنوئیں کو گیڑ نہیں سکتے، اسے چلا نہیں سکتے، پانی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ کنوئیں میں تو بہت پانی ہے مگر ہمارے خوفزدہ جُثّے آنے والی چھمک کے ڈر سے کپکپاتے رہتے ہیں، آہستہ چلتے ہیں۔ وُہ آخری کھیت جو ہیں۔ ہماری سرحد کے قریب وُہ ابھی سے خشک ہونے لگے ہیں۔ وہاں تک پانی نہیں پہنچ رہا۔ دوسرے کنوؤں والے ہم سے آگے نکل رہے ہیں۔ اُن کے کھیت زیادہ سرسبز و شاداب ہیں

اور تمھیں پتہ ہے کہ اگر ہمارے کھیت خشک ہو گئے تو زمین کی پیاسی زبانیں دوسرے کنوؤں کی طرف جھک جائیں گی؟

اگرچہ وہ ایک اکائی ہیں مگر اب دو اکائیوں میں منقسم ہیں، ایک کائی مُشقّتی، دوسری چھمک والی۔

کانجن پر گدھ بیٹھ رہے ہیں۔

ہمارے اُوپر چھاؤں ہو رہی ہے۔

یارک شائر کی گائے

"جُولی" میں نے اُس کے کپکپاتے ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے کہا "پلیز ڈارلنگ، اپنے آپ پر قابو رکھو۔ کیا نئی نویلی دلہنیں یُوں اپنی شادی کے پہلے دن کو خوش آمدید کہتی ہیں؟"

"وہ میرے ڈیوڈ کو واپس کر دیں گے نا ـــــــ فریڈی" جُولی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اُس کے آنسو تھمنے میں نہ آ رہے تھے۔

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں جُولی۔ وُہ اُسے واپس کر دیں گے۔ پلیز اپنے آنسو پونچھ ڈالو" ـــــ میں نے جیب سے سفید رومال نکال کر اُسے تھما دیا اور کھڑکی سے باہر لندن کی پُر ہجوم سڑک ریجنٹ سٹریٹ کی جانب دیکھنے لگا۔

کرسمس میں چند روز باقی رہ گئے تھے۔ سٹورز کے شوکیس آدم خور مگر مچھوں کی طرح اپنے جبڑے کھولے اُن گاہکوں کے انتظار میں تھے جنھیں اپنی محدود آمدنی کے باوجود اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لیے کرسمس کے تحفے ہر صورت خریدنے تھے:

فٹ پاتھ پر چلتے لوگ اور اُن کے چہرے اُن بڑے بڑے رنگین پارسلوں سے چھپ گئے تھے جو وہ اِن سٹورز سے خرید کر لائے تھے ۔ یُوں لگتا تھا جیسے فٹ پاتھ پر انسان نہیں بڑے بڑے رنگین پارسل حرکت کر رہے ہوں ۔ ایک سٹور کے صدر دروازے کے باہر فادر کرسمس ایک اُونچے سٹول پر بیٹھا ننھے مُنّے بچّوں کو اپنے پاس بُلا رہا تھا تاکہ وہ اُس کے کان میں اُن بے شمار تحفوں کی فہرست سُنا دیں جو وُہ کرسمس کی شب اپنے بستروں کے ساتھ لٹکی لمبی جرابوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ فادر کرسمس ایک خرانٹ بوڑھے کی طرح بچّوں کی فرمائشیں سُنتا اور پھر چُپکے سے اُن کی فرمائشی فہرست اُن کے والدین کو تھما دیتا...... بچّے جو قدرت کا معصوم ترین تحفہ ہیں۔ انسانی نسل کی بقا کی گول مول اور معصوم کڑی .... اور پھر اُسے ڈیوڈ کا خیال آ گیا۔ وہ اور جُولی آج صبح ہی رجسٹرار کے دفتر میں جا کر شادی کے بندھنوں میں بندھے تھے...... اور اب صرف پانچ گھنٹے بعد وہ سوشل ویلفیئر کی ایجنسی کے دفتر میں بیٹھے اپنے بیٹے ڈیوڈ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ ابھی تک شادی کے لباس ہی میں ملبوس تھے۔ فرید ڈارک سُوٹ میں...... ڈارک .... اور جُولی سفید لباس میں...... سفید...... جُولی کی معصومیت کی مانند —— اور ڈیوڈ —— اُن کا اَن دیکھا بیٹا۔

"کتنا عرصہ ہُوا ہے اس بات کو ؟" فرید نے ذہن پر زور ڈالا ——

"تین برس شاید ——"

فرید لنڈن کے ایک نواحی قصبے میں ایک نارمل پاکستانی کی زندگی گذار رہا تھا۔ وہ منہ اندھیرے اُٹھ کر لنڈن جانے والی ڈبل ڈیکر بس کے گرم سینے میں جا بیٹھتا جو اُسے ایک گھنٹے کے بعد ریڈیو بنانے والی ایک فیکٹری کے سامنے اُتار دیتی۔ پھر اسمبلی لائن کی تیزی سے سرکتی ہوئی بیلٹ گذرتے وقت کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے حرکت کرنے لگتی۔ ہر ایک منٹ کے وقفے کے بعد اس کے سامنے ریڈیو

کا ایک ڈھانچہ آ جاتا جس کے سُوراخوں میں وہ مختلف قسم کے پیچ اور ٹمبن پُھرتی سے کَس دیتا...... ایک مکانکی انسان کی طرح سارا دن وُہ سر جُھکائے کام میں مصروف رہتا۔ شام کو گھر واپس آ کر پچھلے اتوار کی پکائی ہوئی دال کو بگھارتا اور اسے ڈبل روٹی کے ساتھ نگل کر سو رہتا ۔ اس باقاعدہ روٹین کو صرف ہفتے اور اتوار کو جھٹکے لگتے۔ ہفتے کا دن شاپنگ کے لیے مخصوص تھا۔ وُہ چیزوں کی فہرست جیب میں ٹھونسے پوری دوپہر شاپنگ سنٹر میں حرکت کرتا رہتا ۔ دو درجن انڈے، مٹروں کے بند ٹین، گوشت۔ ہندو لالے کی دکان سے پِسی ہوئی سُرخ مرچیں، ادرک، تھوم وغیرہ۔ اس دوران وہ پوسٹ آفس جا کر ایک ایروگرام پر خیریت کے چند لفظ گھسیٹ کر اپنی بوڑھی ماں کو بھیجتا۔ پانچ بجے سے چھ بجے تک وہ لانڈریٹ کی دکان میں جا کر ہفتہ بھر کے گندے کپڑے مشین میں ٹھونستا اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر سرخ بتی کے جلنے کا انتظار کرتا رہتا۔ چھ سے سات بجے تک کپڑے بدل کر مقامی کافی ہاؤس میں آ بیٹھتا —— اگر ان دنوں کسی لڑکی سے جان پہچان ہوتی تو وُہ اُسے لے کر پچھلی نشستوں پر براجمان ہو کر فلم تو خیر کم ہی دیکھتا۔ عام حالات میں وہ دس بجے تک اُس کافی ہاؤس میں بیٹھا رہتا اور پھر چپکے سے اپنے کمرے میں واپس چلا جاتا۔ اتوار کا روز ہانڈی بنانے میں صرف ہوتا اور وہ گوشت بھوننے کے دوران "نیوز آف دی ورلڈ" میں چھپے سیکنڈلز پر بھی ایک نظر ڈال لیتا۔ ایک نارمل پاکستانی کی نارمل زندگی —— ہاں البتہ اس روٹین میں کبھی کبھار جُولی حائل ہو جاتی ——

وہ پہلی مرتبہ کہاں ملے تھے : —— پتہ نہیں کس کی پارٹی تھی ——

فرید ڈرافٹ بیئر کا مگ ہاتھ میں تھامے کمرے میں رقص کرتے ہوئے جوڑوں کو بے حد مایوسی سے دیکھ رہا تھا —— پچھلے دو گھنٹوں سے وہ صوفے میں دھنسا بیئر پی رہا تھا —— سب لڑکیاں اپنے دوست لڑکوں کے ہمراہ تھیں اور یُوں لگتا تھا جیسے فرید پوری شب یونہی اکیلا بیٹھا رہے گا —— اور پھر جُولی کمرے

میں داخل ہوئی ـــــــ فرید نے فوراً بئیر کا مگ تپائی پر رکھ دیا۔ جُولی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور ترتیلیوں میں اٹکے چھوٹے چھوٹے سینڈوچز بڑی بے دلی سے کھانے لگی ـــــــ اکثر پاکستانیوں کی طرح فرید کو تمام انگریز لڑکیاں بیحد حسین لگتیں۔ گوری چِٹی اور صحت مند ـــــــ مگر جولی کسی صورت میں قابلِ قبول حد تک بھی خوش شکل نہ تھی ـــــــ اُس کے چہرے پر گائے کے گوشت ایسی بھدی سُرخی تھی اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے بچّوں ایسے چٹاخ پڑے ہوئے تھے۔ بال گدلے بھُورے رنگ کے کچّروں ایسے بے ترتیبی سے ہر سُو بکھرے ہوئے، جسم بے حد غیر متناسب ـــــــ کولہے بھاری مگر اُس سے اُوپر کی سطح تقریباً ہموار اور نشیب و فراز سے عاری۔ اس کا لباس بھی بیحد عامیانہ تھا ـــــــ یُوں جیسے کسی ٹاٹ کے تھیلے میں اُپلے بھرے ہوں ـــــــ چہرے کے تاثرات سے یُوں لگتا تھا جیسے وُہ قدرے ابنارمل ہو ـــــــ فرید نے مایوسی کے عالم میں پورا مگ ایک ہی سانس میں اپنے اندر انڈیل لیا اور سگریٹ سُلگا کر پارٹی سے جانے کے بارے میں سوچنے لگا ـــــــ جس لڑکی کی جانب دیکھنے سے جی متلائے بھلا اس کے ساتھ رقص کیسے کیا جا سکتا تھا ـــــــ وہ میزبان کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا اور ہائی سٹریٹ کے سٹورز کے شوکیسوں میں جھانکتا اُن قیمتی سوئیٹروں اور قمیصوں کو دیکھتا رہا جو اُس کی محدود آمدن کی زد سے باہر تھیں ـــــــ کرسمس کو صرف دس روز باقی تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مرتبہ خود ہی ایک اچھا سا سوئیٹر خرید کر اپنے آپ کو کرسمس کے تحفے کے طور پر پیش کرے۔ آخری بس ساڑھے گیارہ بجے چلتی تھی۔ چنانچہ وہ تیزی سے چلتا ہُوا بس سٹاپ پر پہنچ گیا ـــــــ وہاں جولی کھڑی تھی ـــــــ وہ ایک طرف ہٹ کر سگریٹ پینے لگا۔ بس میں سوار ہُوا تو اُسے ساتھ والی نشست پر بیٹھی جولی کو دیکھ کر انتہائی اُکتاہٹ کا احساس ہُوا ـــــــ یہ اُس کی بدقسمتی تھی کہ آج شب اُسے گائے کی صورت کی یہ لڑکی ہر جگہ دکھائی دے رہی تھی ـــــــ

"میرا خیال ہے میں نے آپ کو مائیکل ولسن کی پارٹی پر دیکھا تھا ـــــــ"

جُولی شکل سے بے حد بیوقوف لگ رہی تھی، بے وقوف گائے۔

"ہیلو" ـــــــ فرید نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور پھر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا ـــــــ تھوڑی دیر کے بعد بس رُکی اور جُولی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ـــــــ" اُس نے فرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــــــ "پھر ملیں گے" ـــــــ سراسر رسمی فقرے جو انگریز دن رات بڑبڑاتے رہتے ہیں۔

"ہاں ضرور" ـــــــ فرید نے بے دھیانی سے کہا اور اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نشست میں دبک گیا۔ سردی تھی۔

اگلے ہفتے وہ اپنے مخصوص کونے میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ کافی بار کے دروازے میں سے جُولی اندر داخل ہوئی

"اوہ ـــــــ بادر" وہ بڑبڑایا اور شیشے کی بڑی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"اوہ ـــــــ ہیلو" ـــــــ جُولی اس کے سر پر کھڑی تھی۔

"ہیلو ـــــــ" اس نے بادلِ نخواستہ جواب دیا اور سر جھکا کر کافی پینے لگا۔

"آپ سے دوبارہ ملاقات ـــــــ بہت خوشی ہوئی" ـــــــ وہ جھجکتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"اگر آپ پسند کریں تو یہاں بیٹھ جائیں ـــــــ" فرید نے اس درخواست کے لہجے میں اکتاہٹ اور ناپسندیدگی خاصی واضح کر دی۔

"شکریہ ـــــــ" جُولی نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور بلا تردد فرید کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

آج کی شب تو غارت گئی ـــــــ فرید نے منہ بنا کر سوچا۔

جُولی بے حد آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی ـــــــ اُس کا باپ لوہا ڈھالنے

والی ایک فیکٹری میں مزدور تھا اور وہ سکول سے جی ای سی کا امتحان پاس کر کے اب میونسپل کالج میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ رہی تھی ——— گفتگو کے اس بہاؤ میں فرید "جی" ——— "اور واقعی" "اور" اچھا تو ایسا ہے"۔ جیسے لایعنی پتھر ڈبوتا رہا اور اپنی قسمت کو کوستا رہا۔ اس سے اگلے ہفتے پھر ایسا ہی ہوا مگر جولی اس مرتبہ سیدھی اُس کی میز تک آئی اور اجازت کے بغیر اُس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ اب کی بار شاید فرید کی قوتِ برداشت بہتر ہو چکی تھی اس نے "جی" اور "اوہ واقعی" کے علاوہ ایک آدھ فقرہ موسم کے بارے میں بھی کہہ دیا۔

"فریڈی دیکھئے پرسوں ہمارے ہاں کرسمس شب کی پارٹی ہے آپ آئیں گے؟" جولی نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

فرید کے جی میں آیا کہ صاف کہہ دے "جولی میں اپنے نئے سال کا آغاز تم جیسی صورتوں کی رفاقت میں نہیں کرتا"۔ لیکن جولی کے چہرے پر بچگانہ شوق کے تاثرات دیکھ کر کچھ نہ بولا

"آپ آئیے ضرور" ——— جولی نے اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے پھر کہا۔

"برمنگھم اور مانچسٹر سے چند پرانے دوست آ رہے ہیں۔ کرسمس شب لنڈن کے البرٹ ہال میں گذارنے کا ارادہ ہے میں معذرت خواہ ہوں"۔ فرید کے سپاٹ لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ گریز کر رہا ہے اور پھر کرسمس شب کے لیے اس نے وُل ورتھ سٹور کے کاؤنٹر پر سوئیٹر بیچنے والی لڑکی کو مدعو کر رکھا تھا ——— ایک بے پناہ حیوانی جسم کی مالک لڑکی جسے صرف اُن کاؤنٹرز پر رکھا جاتا جہاں کی آمدن میں کمی ہوتی اور اس کے وہاں کھڑے ہوتے ہی سیل میں دُگنا اضافہ ہو جاتا۔

"کوشش کیجیئے گا پلیز" ——— جولی نے بے حد لجاجت سے درخواست کی اور پھر کافی بار سے باہر چلی گئی ———

فرید کرسمس شب آٹھ بجے تک وُل ورتھ سٹور والی لڑکی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر شاید یہ جولی کی دُعاؤں کا اثر تھا وہ نہ آئی ———

"کرسمس شب سال میں صرف ایک مرتبہ آتی ہے" ——— فرید نے بور ہو کر فیصلہ کیا "گھر جا کر سو جانے سے بہتر ہے کہ جولی کے ہاں چلا جائے"۔ اور یوں جولی کرسمس کی شب کو فرید کی رفیق بنی۔

پھر یونہی دن گذرتے رہے۔ فرید کئی مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہفتے کے روز کافی بار کے کونے میں بیٹھا پاتا۔ جولی آتی اور حسبِ معمول کافی کی ایک پیالی پر دُنیا جہان کی باتیں کر کے چلی جاتی۔ فرید اس دوران دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھی باہر جاتا مگر جولی کی رفاقت یوں اُسے اچھی لگتی کہ اُسے اُس کے سامنے دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں بنا نہیں پڑتا تھا۔ سیدھا سیدھا اصلی اور قدرتی فرید ——— کئی مرتبہ اُسے شب گذارنے کے لیے اور کوئی لڑکی نہ ملتی تو وہ جولی کو بُلا لیتا اور وہ دونوں کسی سینما ہاؤس یا رقص گاہ میں شب بسر کرتے ——— ان کے اس رشتے میں جنس کو بالکل دخل نہ تھا ——— رقص کرتے ہوئے یا اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے فرید کا کبھی جی نہ چاہا کہ وہ اُس کے ساتھ باتوں کے علاوہ اور کچھ بھی کرے ——— اور یقیناً جولی اُسے کرنے بھی دیتی۔ مگر اُس کی شکل پہلے روز کی نسبت بہتر ہرگز نہیں ہوئی تھی۔ یارک شائر کی گائے ایسی شکل کی جولی۔

ایک روز فرید حسبِ معمول کافی بار میں اپنے پسندیدہ کونے میں بیٹھا شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ ایک مشرقی خدوخال کا حامل نوجوان کافی بار میں داخل ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور پھر فرید کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ یقیناً ولایت میں نووارد تھا۔ اس کا ثبوت وہ آرڈر تھا جو اُس نے اٹکتے ہوئے ویٹرس کو دیا۔ ایک پیالی چائے اور ہین سینڈوچ ——— اِس نے مرغی کا ترجمہ چکن کی بجائے ہین کیا تھا۔

"نوآر پاکستانی ــــــ ہیں جی؟" اُس نے فرید سے مخاطب ہو کر نہایت بے تکلفی سے کہا۔

"جی ہاں" ــــــ فرید نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

"یار میری زبان میں گرہیں پڑ گئی ہیں انگریزی بول بول کے۔" اُس نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "ایک ہفتہ ہو گیا ہے گوروں کے ملک میں آئے ہوئے ــــ آپ کا اسمِ شریف۔"

فرید نے اپنا مختصر تعارف کرا دیا ــــــ نووارد پاکستانی جس کا نام ناصر تھا اپنی چائے کی پیالی ختم کرنے سے پیشتر ہی اتنی بے تکلفی پر اُتر آیا تھا کہ وہ بار بار قہقہے لگاتا اور بات بے بات پر فرید سے ہاتھ ملاتا۔ وُہ پاکستان میں سکول ٹیچر تھا اور اب اپنا آبائی مکان بیچ کر انگلینڈ چلا آیا تھا۔ انگریزوں کو چونکہ اُس کی تدریسی صلاحیتوں پر اعتماد نہ تھا۔ اِس لیے اُسے فی الحال ایک سٹور میں کھڑکیاں چمکانے کی نوکری دی گئی تھی ــــــ دوسرے دن وہ بِن بلائے فرید کے کمرے میں آدھمکا اور فرید کی اتوار کی پکائی ہوئی دال جو پورے ہفتے کے لیے کافی تھی۔ ایک ہی نشست میں چٹخارے لیتا ہُوا کھا گیا۔ اس قصبے میں چونکہ خلافِ معمول پاکستانیوں کی تعداد تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے فرید اس کی بے جا بے تکلفی کے باوجود اس کا دوست بن گیا۔

ایک روز وہ نہایت عمدہ سُوٹ میں کافی بار میں داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھوں میں چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈبّہ تھا۔

"لڑکیاں کہاں ہیں؟" اُس نے آتے ہی فرید سے نہایت سنجیدگی سے پُوچھا۔

"کون سی لڑکیاں ناصر؟"

"بھئی وہی جنھیں چاکلیٹ آفر کر کے پھنسا لیا جاتا ہے۔ اپنے ایک ولایت پلٹ دوست نے یہ نسخہ بتایا تھا۔" اُس نے نہایت ٹھسّے سے اعلان کیا۔

فرید اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ ولایت پلٹ دوست نے یقیناً اُسے بتایا ہو گا کہ اگر کسی دعوت میں لڑکی سے راہ و رسم بڑھانی مقصود ہو تو گفتگو کے آغاز کے لیے اُسے چاکلیٹ یا میز پر پڑی کوئی خوراک آفر کی جاتی ہے۔ صورتِ حال کا علم ہونے پر ناصر بےحد مایوس ہُوا "میں نے تو دو پونڈ کی رقم اس کمبخت ڈبے پر بیکار ہی کر دی ہے۔"

اُسی لمحے جُولی کافی بار میں داخل ہوئی اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر فرید کے پاس آ بیٹھی۔ ناصر کا تعارف بھی ہُوا۔

اس شب جب وہ دونوں گھر لَوٹ رہے تھے تو ناصر نے پوچھا۔

"یار فرید یہ جُولی تمھاری گرل فرینڈ ہے۔"

"نہیں ــــــ بس تھوڑی بہت واقفیت ہے۔"

"تو یار پھر میرا کام بنا دو ــــــ" ناصر نے فوراً کھڑے ہو کر اس کے شانے پکڑ لیے ــــــ "خدا کے لیے ــــــ مجھے گرل فرینڈ بنانے کا بڑا شوق ہے۔"

فرید سوچ میں پڑ گیا ــــــ جُولی کی بدصورتی اپنی جگہ پر ــــــ لیکن وہ اچھی لڑکی تھی ــــــ شاید اُسے بھی اچھّی لگتی تھی ــــــ گر نہیں یار کہ شائد کی گائے ــــــ توبہ ــــ!

"ٹھیک ہے ــــــ کل صرف تم کافی بار چلے جانا ــــــ میں نہیں جاؤں گا۔" اُس نے ہولے سے کہا۔

تیسرے روز جُولی کا فون آیا ــــــ فریڈی ــــــ مجھے افسوس ہے تم زکام کی وجہ سے کل کافی بار نہیں آ سکے ــــــ مجھے تمھارے دوست ناصر نے بتایا تھا ــــــ اور سنو فریڈی وہ ناصر مجھے بار بار ڈیٹ کے لیے پوچھ رہا ہے۔ صبح سے تین فون آ چکے ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"کیا میں اُس کے ساتھ باہر چلی جاؤں؟"

"کیوں نہیں ــــــ اگر تمھیں وہ پسند ہے تو ــــــ"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"شور؟"

"ہاں ٹوٹلی شور"

اس کے بعد ناصر نے جولی کو جیتنے کے لیے کریش پروگرام شروع کر دیا سینما، کافی ہاؤس، دعوتیں ——— تحفے ——— غرضیکہ پورا شو...... تین ہفتے کے بعد فرید کو جولی نے فون پر بتایا کہ ناصر نے اسے شادی کے لیے کہا ہے۔

"مبارک ———" فرید نے عجیب سی بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی نہیں فریڈی ———" جولی کہہ رہی تھی ——— "میں تمہاری رائے لینا چاہتی ہوں ———"

"کیوں نہیں ——— اگر تمہیں وہ پسند ہے تو ———"

"فریڈی" ——— جولی نے بے حد آہستہ سے کہا ——— "آخر تم اتنے سرد مزاج کیوں ہو ——— ناصر تمہارا دوست ہے ——— اور تم میرے۔ کیا تم مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مدد نہیں دے سکتے۔"

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تم دونوں ———" دوسری جانب سے کلک کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا۔

"بیوقوف گائے ———" فرید نے منہ بنا کر کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔

ہفتے کے روز وہ دیر تک کافی بار میں بیٹھا رہا مگر حسبِ سابق جولی نہ آئی۔ ناصر بھی غائب تھا۔ اس سے اگلے ہفتے بھی ایسا ہی ہوا۔

"کسے پرواہ ہے ———" تیسرے ہفتے فرید نے کافی بار سے نکلتے ہوئے اپنے آپ سے کہا ——— "ناصر کا بچہ اور وہ گائے شاید ابھی سے ہنی مون منا رہے ہیں۔"

ایک روز فیکٹری سے واپسی پر فرید کِل برن سٹریٹ پر اُتر گیا جہاں ناصر رہتا تھا۔

"وہ خبیث کا بچہ" بوڑھی لینڈ لیڈی ناک چڑھا کر بولی ——— "دو ہفتے کا

کرایہ بھی نہیں دیا اور بھاگ گیا یہ پاکستانی ———!"

فرید کی زندگی پھر اُسی مکانکی ڈگر پر گزرنے لگی۔ فیکٹری ——— گھر ——— کافی بار فیکٹری ——— اذیت وہ موسم سرما مئی کے آخر تک انسانی جسموں کو ٹھنڈا کرتا رہا ——— موسمِ گرما میں بھی بارشیں ہوتی رہیں اور ایک مرتبہ پھر سردی اپنے خنک پنجے ننگے کیے وارد ہو گئی۔

فرید کافی بار میں بیٹھا انتہائی سنجیدگی سے وطن واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"ہیلو فریڈی!" اس نے سر اُٹھا کر دیکھا ——— جولی تھی۔ گائے کے گوشت کی سُرخی اب زردی میں بدل چکی تھی! وہ انتہائی کمزور دکھائی دے رہی تھی۔

"اگر تم مائنڈ نہ کرو تو بیٹھ جاؤں ———"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" فرید نے گرمجوشی سے کہا۔

بالکل غیر متوقع طور پر جولی کی آمد ——— فرید کے لیے انتہائی مسرت انگیز تھی ——— "بہت عرصے کے بعد ———" فرید نے کہنا شروع کیا۔ "ہاں بہت عرصے بعد" جولی نے بے دھیانی سے کہا۔

"ناصر کہاں ہے؟"

"ناصر ———" جولی نے چونک کر کہا ——— "تمہارا دوست تھا تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔"

یہ آج سے ایک برس پہلے والی جولی نہ تھی ——— بے وقوف اور بدھو قسم کی لڑکی ——— اس کی باتوں میں ٹھہراؤ تھا ——— اعتماد تھا ——— اور اداسی تھی۔ اور پھر حیرت انگیز طور پر وہ بالکل بدصورت نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ اُس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کشش تھی۔

"بہت عرصے کے بعد ———" فرید نے ایک طویل خاموشی کے بعد پھر گفتگو کا

آغاز کرنا چاہا۔

"ہاں ——— ایک طویل عرصے کے بعد ———" جُولی نے فرید کی جانب دیکھا اور مسکرا دی ——— میں صرف تمھیں اپنا دوست سمجھتی ہوں اور میں اپنے دوست سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی ——— کچھ بھی"

جُولی نے اُسے بتایا کہ ناصر نے اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا دی۔ اس انگوٹھی کی ڈھال کے پیچھے ناصر کا بستر تھا اور اس انگوٹھی پر اعتماد کرتے ہوئے جُولی اُس بستر پر جا لیٹی۔ دو ماہ تک جب تخلیقی حزن کے چشمے خشک رہے تو ناصر شادی کے لیے اپنے دوستوں کو لنڈن سے بُلانے کے بہانے گیا اور چلا گیا۔ جُولی کے سوتیلے باپ کو جب صورتِ حال کا علم ہُوا تو اُس نے اُسے گھر سے نکال دیا ——— ایک خیراتی ہسپتال میں جُولی نے ناصر کے بچے کو جنم دیا اور چونکہ جُولی بِن بیاہی ہونے کے علاوہ ابھی زیرِ تعلیم تھی اس لیے سوشل ویلفیئر ایجنسی نے بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

"فریڈی ——— میرا ڈیوڈ بے حد پیارا تھا" جُولی کہہ رہی تھی ——— بے حد"

فرید اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا ——— اُسے چاہیئے تھا کہ وہ جُولی جیسی بھولی بھالی لڑکی کی دیکھ بھال کرتا لیکن اُس نے تو جان بوجھ کر اس بدصورت بوجھ کو ناصر پر لاد دیا تھا ——— لیکن جُولی اب تو بدصورت نہ تھی ——— یا شاید فرید نے اُس کے اندر چھپے ہوئے سچے جذبات کے سمندر کی آواز سُن لی تھی ——— شاید اُسے اس لڑکی کو دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی۔

"جُولی" ——— فرید نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انتہائی پیار سے پُوچھا ——— "تم اپنے بچے کو ——— ڈیوڈ کو اپنے پاس کیوں نہیں رکھتیں ——— تم آسانی سے کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہو سکتی ہو ———"

"میں نے ان کی بہت منت سماجت کی کہ وہ مجھے ڈیوڈ کو اپنے پاس رکھنے دیں ——— مگر سوشل ویلفیئر آفیسر نے کہا کہ بچہ صرف اس صورت میں مجھے دیا جا سکتا ہے اگر اس کا باپ مجھ سے شادی کر لے ——— پرابلمز ——— پرابلمز" پھیکی مُسکراہٹ تلے جُولی کے ہونٹ ہلے ——— "تم بتاؤ زندگی کیسی ہے ———"

"زندگی ———" فرید جیسے کسی خواب سے بیدار ہُوا ہو ——— "پتہ نہیں ——— بس ٹھیک ہے ——— جُولی" ——— اس نے یک دم اتنی بلند آواز سے کہا، کہ آس پاس بیٹھے لوگ اُن کی جانب متوجہ ہو گئے ——— "جُولی" ——— اس نے سرگوشی کی ——— "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ———"

"پلیز آپ دونوں اندر تشریف لے آئیے" ——— سوشل ویلفیئر آفیسر نے اپنے دفتر کا دروازہ کھول کر نہایت سنجیدگی سے انھیں اندر آنے کو کہا۔

"جُولی ڈارلنگ" اس نے کھڑے ہو کر جُولی سے کہا ——— اور جُولی اپنی سوچ کی دنیا سے باہر آ گئی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں ———" آفیسر نے اپنی نشست پر بیٹھ کر مُسکراتے ہوئے دریافت کیا ——— فرید نے اُسے بتایا کہ وہ دونوں ڈیوڈ کے والدین ہیں، اب شادی کر چکے ہیں اور اپنے بچّوں کو لینے آئے ہیں۔

"ڈیوڈ ———" آفیسر نے سوچتے ہوئے کہا ——— "میں دیکھتا ہوں ———" اُس نے دراز میں سے ایک فائل نکال کر ورق گردانی شروع کر دی ——— جُولی کی آنکھیں فائل کے پھڑپھڑاتے صفحوں پر یُوں لگی تھیں جیسے ان سب پر ڈیوڈ کی تصویر ہو ———

"زندگی ———" آفیسر نے ہاتھ پھیلا کر فائل بند کر دی "ڈیوڈ کو آج صبح ہی ایک شادی شدہ جوڑے کے حوالے کر دیا گیا ہے ——— اب وہ قانونی طور پر ان کا بیٹا ہے۔ آئی ایم سوری ———"

کوٹ مراد

ایک زنجیر لائی گئی۔

"کھانوں یہ تمہارے پاؤں میں ڈال دیں؟"

"میں کوئی جنور تے نئیں ——"

"نہیں نہیں تم انسان ہی ہو جانور تو نہیں لیکن ——"

منور خان ٹھکیدار کہتا ہے —— "میں نے کھانوں کو پہلی مرتبہ چھ ماہ پیشتر دیکھا تھا —— میری بلڈنگ سائٹ پر کام کرنے والے دو راج عید گذارنے اپنے گاؤں کوٹ مراد گئے، تو واپسی پر دو مزدوران کے ہمراہ تھے۔ —— ٹھیکیدار صاحب یہ اپنے گاؤں کے لڑکے ہیں۔ وہاں ناکارہ پھرتے تھے ہم انہیں ساتھ لے آئے ہیں مضبوط جُثے کے ہیں جانوروں کی طرح کام کریں گے۔ مزدوری بھی جو دیں گے جب دیں گے راضی خوشی لے لیں گے —— مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا —— ایک تو جفری تھا چھیڈکا سا، جب صاف ستھرے کپڑے

پہنتا تو بالکل شہری لگتا اور دوسرے کا نام کھانوں تھا.... کالا شاہ (راج اسے کالا شاہ کا کو کہتے) جیسے کوئلے پیس کر لیپ کیا گیا ہو جثہ موٹا اور بے ڈھبا لیکن گندم کی بھری ہوئی بوری کی طرح سخت اور پیڈا۔ بال دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ پتہ نہیں کیسے تھے، البتہ آنکھیں مہین مہین بھیریاں تھیں جو گھومتی رہتیں۔ میں نے اس کا پورا نام پوچھا تو کہنے لگا "چوہدری خان محمد"۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا اس لئے نہیں کہ وہ عام مزدوروں کی طرح بخیر، نکّی یا سادو نہیں تھا بلکہ چوہدری خان محمد تھا بلکہ یہ اس کی آواز تھی جو اس کے جثے کے سیاہ کنویں میں سے ایک بوڑھے مینڈک کی طرح گھاں گھاں کرتی برآمد ہوئی تھی۔ آئندہ دنوں میں جب بھی اس سے کچھ پوچھتا تو پہلے اپنے آپ کو اس کی گھگھیائی ہوئی مردہ آواز کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیتا اور میں کبھی تیار نہ ہو پاتا اس کا منہ کھلتا اور میں پہلے لفظ کی گھاں پر ہمیشہ قدرے ٹھٹک جاتا..... اس کے چلنے پھرنے کا انداز بھی کچھ عجیب سا تھا یا مجھے نظر آتا تھا۔ وہ یوں قدم اٹھاتا جیسے اس کے پاؤں میں چکی کے پاٹ پروئے ہوئے ہوں۔ یا قدم اٹھاتے ہوئے اس کا سارا وزن اس ایک پاؤں میں منتقل ہو گیا ہو۔ اس کے بازو بھی کسرتی تھے۔ بس کالے گوشت کے لٹھ نے تھے انہیں وہ پہلوؤں میں لٹکا کر نہیں چلتا تھا بلکہ پیٹ کے آگے ہتھیلیاں کھولے رکھتا جیسے کچھ اٹھا رکھا ہو۔

ایک روز وہ کام پر نہ آیا۔

میں اسے دیکھنے کی خاطر مزدوروں کے لئے بنے ہوئے چھپر میں گیا تو اس کی ہائے ہائے سے پورا چھپر گونج رہا تھا۔"

"کیا ہوا کھانوں؟"

"جی کس چڑھ گئی اے —— ہائے۔"

"کچھ دوا دارو کیا؟"

"ہیں جی —— ہائے۔" میرا خیال ہے کہ بیماری میں دوائی وغیرہ کا استعمال

اس کے لئے کچھ ناقابلِ فہم تھا۔

"زیادہ تکلیف ہے جو اتنی بلند آواز میں ہائے ہائے کر رہے ہو؟"

"تکلیف تے نئیں جی —— ہائے ہائے کرن نال کُس گھٹ ہو جاندی اے جی"

دوسرے روز اس کا بخار واقعی اتر چکا تھا۔

"اب کیا حال ہے کھالوں؟"

"جی باہر دی کُس تے اُتر گئی اے، اندر دی ہے"

"ہیں؟" اب یہ میرے لئے کچھ ناقابلِ فہم تھا کہ باہر کا بخار اُتر گیا ہے اور اندر کا باقی ہے۔

تیسرے روز حسبِ معمول وہ اپنے بوجھل قدم اُٹھا اُٹھا کر بلڈنگ سائٹ پر کام کر رہا تھا۔ بچوں کو چھٹیاں تھیں وہ میرے ساتھ ہی بلڈنگ سائٹ پر آ گئے اور حسبِ معمول ریت کے گھروندے بنانے میں مگن ہو گئے۔ پھر انھوں نے کھالوں کو دیکھ لیا۔ پہلے تو وہ ایک محفوظ فاصلے پر کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھتے رہے جیسے بلی کا بچہ کسی مینڈک کے ساتھ کھیلنے سے قبل اس کا تفصیلی مشاہدہ کرتا ہے کہ یہ کیا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچ کر کہ سیاہ گوشت کا یہ تودہ بالکل بے ضرر ہے وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کھالوں اپنا دابڑہ اٹھائے جدھر جاتا وہ اس کے دائیں بائیں ہو ہو کر اس کا چہرہ دیکھتے اور اس کی بن مانسوں ایسی چال سے لطف اندوز ہوتے۔ دوپہر کے وقت جب کھالوں نے اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی چکّی کے پاٹ اتنی پانچ روٹیوں کو چار چار حصّوں میں تقسیم کر کے فی الفور نگل لیا تو ان کی مسرت عروج پر تھی۔

...... وہ ہر ٹکڑا بڑی مہارت سے تہہ کرتا اور لپیٹ لپاٹ کے مُنہ کے اندر گھسیٹر لیتا اس کے جبڑے ہلتے اور وہ ایک ڈکار نما آواز بلند کر کے اسے پیٹ کی طرف دھکیل دیتا پھر بچوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور گھاں گھاں کرتے ہوئے سر ہلاتا کہ بہت مزا آیا ہے۔ اگلے روز بچوں نے پھر بلڈنگ سائٹ پر چلنے کی ضد کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ ایک تو ان کی وجہ سے میرے کام میں ہرج ہوتا تھا۔

اور دوسرے یہ کہ وہ کل سے کھالوں کی طرح چلنے اور کھانے کی مشق میں معروف ہو گئے اور یہ صورتِ حال قابلِ فہم طور پر میرے لئے قابلِ قبول نہ تھی۔

ایک روز پھر وہ کام پر نہ آیا..... میں نے اس کے بعد کھالوں کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ منور خاں ٹھیکیدار درست کہتا تھا کیونکہ کھالوں کی زندگی کا ایک باب اختتام پذیر ہو چکا تھا۔

کھالوں واقعی گاؤں میں ناکارہ پھرتا تھا۔ اس قسم کے کھالوؤں کا خاندانی پس منظر وغیرہ نہیں ہوتا۔ وہ بس ہوتے ہیں مٹی سے پیدا ہو کر مٹی ہو جاتے ہیں۔ اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کبھی کوئی کھالوں بھی ہوتا تھا۔ بہرحال ہمارے والا کھالوں گاؤں کے راج مستریوں کی مہربانی سے شہر پہنچا اور مزدوری کرنے لگا —— وہ فجر کے وقت اُٹھ بیٹھتا اور پتہ نہیں کون سی زبان میں نماز پڑھتا پھر سر جھکا کر قرآن پاک کھولتا اور اس کی عبارت پر اپنی بھدی انگلیاں پھیرنے لگتا۔ اسے یقین تھا کہ آئتیں صرف پڑھے لکھوں کے لئے ہی نہیں ہیں بلکہ اس جیسے چِٹّے ان پڑھ اگر ان پر صرف انگلیاں ہی پھیرتے رہیں تو بھی کچھ نہ کچھ ثواب ہو جاتا ہے —— پھر وہ کام کاج میں جُت جاتا اور شام کو دابڑہ اور کہئی کو زمین پر رکھنے والا وہ آخری مزدور ہوتا۔ وہ رزقِ حلال پر بھی یقین رکھتا تھا —— البتہ جمعے کے روز چھٹی ہوتی وہ قریبی مسجد میں جا کر انتہائی باوقار صاف ستھرے اور تقدس کے چہرے والے نمازیوں کی صفوں میں گھُس کر بیٹھ جاتا اور اسے ہمیشہ خاصی جگہ مل جاتی کیونکہ انتہائی باوقار صاف ستھرے اور تقدس کے چہرے والے نمازی کراہت میں رینگتے رینگتے اس سے دور ہو جاتے۔

اُدھر چڑیا گھر کا افسرِ اعلیٰ بے حد پریشان تھا۔

چڑیا گھر کا افسرِ اعلیٰ اس لئے بے حد پریشان تھا کہ پچھلے چار جمعوں سے چڑیا گھر میں آنے والوں کی تعداد میں پُرتشویش اضافہ ہو رہا تھا —— اور پُرتشویش اس لئے کہ تعداد جب بڑھے تو ہجوم بنتی ہے اور ہجوم اکثر اوقات بے قابو ہو کر نعرے لگانے لگتا ہے اور مردہ باد کے نعرے کسی کو اچھے نہیں لگتے اور اس چڑیا گھر کا افسرِ اعلیٰ

پریشان تھا کہ اگر افسران بالا کو اس عوامی اجتماع کی خبر ہو گئی تو اس کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی کیونکہ ان دنوں عوامی اجتماع صرف چڑیا گھروں میں ہی ممکن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ افسر اعلیٰ نے اپنے سے ادنیٰ تمام ملازمین کو بلا کر چڑیا گھر کی یک لخت مقبولیت کا سبب دریافت کیا لیکن وہ مُہر بلب رہے کیونکہ ان دنوں مُہر بلب رہنے کا بھی رواج تھا۔ بالآخر اس نے اپنے ایک با اعتماد کلرک کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ اس امر کا سراغ لگائے کہ جمعہ کے روز لوگوں کی آمد میں اضافہ کیوں ہو جاتا ہے۔

با اعتماد کلرک نے اگلے ہفتے رپورٹ پیش کی کہ جناب جمعہ کے روز ہجوم کا ایک بڑا حصہ بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک کالے گھڑے نما شخص کھالوں کو دیکھنے آتا ہے۔

"اور یہ کھالوں کیا دیکھنے آتا ہے؟"

"وہ جانور دیکھتا ہے۔"

"تو پھر یہ بچے جانوروں کو کیوں نہیں دیکھتے؟"

"لوگ انہی جانوروں کو بار بار دیکھ کر اکتا چکے ہیں جناب —— وہ تبدیلی کے خواہشمند ہیں چنانچہ یہ جو کھالوں ہے اس کی حرکات اور چال ڈھال سے وہ بے حد محظوظ ہوتے ہیں اور ہمہ وقت اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔"

افسر اعلیٰ نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا —— اگر بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے تو خطرے کی کوئی بات نہیں بچے جب بڑے ہو کر مردہ باد کہنے کے قابل ہوں گے تو پھر دیکھا جائے گا۔

افسر اعلیٰ جب دفتر سے باہر آیا تو سامنے سے کھالوں آ رہا تھا۔ وہ ہر پنجرے کے سامنے کھڑے ہو کر اس میں قید جانور کو پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتا تھا اور اس کے پیچھے بچوں کا ایک ہجوم اسے پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتا تھا۔

کھالوں ان دنوں منور خاں ٹھیکیدار کی بلڈنگ سائٹ پر مزدوری کرتا تھا اور جمعے کے روز کراہت سے رینگتے ہوئے انتہائی باوقار، صاف ستھرے اور تقدس کے چہرے والے نمازیوں کے ہمراہ نماز پڑھنے کے بعد سیدھا چڑیا گھر دیکھنے آ جاتا تھا۔

اس روز افسر اعلیٰ جب چڑیا گھر کے جانوروں کو دی جانے والی خوراک، ان کی بیماریوں کے لئے دوائیوں اور دیگر انتظامی امور کے حساب کتاب سے فارغ ہوا تو با اعتماد کلرک نے اس کے سامنے افسرانِ بالا کا بھیجا ہوا ایک سرکلر رکھ دیا۔

"آخر یہ کیا چاہتے ہیں؟" افسر اعلیٰ نے سرکلر کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی بیچارگی سے کہا۔ با اعتماد کلرک ایک مؤدب کھانسی کھانسا اور گویا ہوا "ہمارے افسرانِ بالا عوام کو ہمہ وقت خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پورے ملک میں ایک جشن کی کیفیت جاری رہے۔ لوگ سڑکوں پر نہ آئیں۔ بلکہ تفریح گاہوں، پارکوں اور چڑیا گھروں میں آئیں۔ گھروں میں رہ کر کڑھنے سے بہتر ہے کہ انسان تازہ ہوا میں سانس لے اور جانور وغیرہ دیکھے۔"

"اوہو —— اتنی انگریزی تو میں بھی سمجھتا ہوں۔" افسر اعلیٰ ناراض ہو کر بولا "لیکن پہلے تو یہ احکام تھے کہ لوگوں کا ہجوم نہ بننے پائے اور اب یہ سرکلر آ گیا ہے کہ اپنے چڑیا گھر کے ناظرین کی تعداد میں اگر اضافہ نہیں کرو گے تو تمہیں معطل کر دیا جائے گا۔"

"یہ سرکلر میں نے نہیں لکھا" با اعتماد کلرک بھی ناراض ہو گیا۔

"ہوں ــ" افسر اعلیٰ نے اپنے ذہن پر زور ڈالا "اگر ہم چند مگرمچھ، کچھ بنگالی شیر اور اُلّو وغیرہ حاصل کر لیں تو بات بن سکتی ہے۔"

"مشکل ہے جناب ہمارے پاس ان جانوروں کو درآمد کرنے کے لئے زرِ مبادلہ نہیں ہے۔"

"صرف بنگالی شیر حاصل کر لیتے ہیں۔"

"جناب بنگالی شیر بھی درآمد کرنے ہوں گے۔" با اعتماد کلرک خباثت سے مسکرایا۔

"میں اپنی تاریخ سے اتنا ناواقف نہیں ہوں۔" افسر اعلیٰ اپنی حماقت پر جھلا گیا۔

"بہرحال —— مقامی طور پر کون سے جانور حاصل کئے جا سکتے ہیں؟"

"مقامی طور پر ــ" با اعتماد کلرک نے بظاہر کچھ دیر کے لئے سوچا اور پھر سر

کھجا کر کہنے لگا "بھیڑیں اور بھیڑیئے۔"

"کیا احمقانہ باتیں کرتے ہو۔ بھیڑیں دیکھنے کون آئے گا — اور بھیڑیئے۔ لوگ مزید خوفزدہ ہوں گے۔"

افسرِ اعلیٰ اب سوچ میں پڑ گیا، نوکری کا معاملہ تھا۔

"تو پھر — کیا کرنا چاہیئے؟" بالآخر وہ لجاجت سے بولا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پُر اعتماد کلرک کے ذہن میں تمام مشکل امور کا فی الفور حل موجود رہتا ہے اور پر اعتماد کلرک نے فی الفور وہ حل پیش کر دیا "کھاؤں۔"

افسرِ اعلیٰ نے نام سن کر جانور کا تعین کرنے کے لئے فوراً اپنے ذہن میں دنیا کے دیگر درندوں وغیرہ کے نام دہرائے اور پھر شرمندہ ہو کر بولا "کھاؤں؟"

"جی ہاں جناب — " پُر اعتماد کلرک سیدھا ہو گیا "وہی کھاؤں جس کی وجہ سے ہر جمعہ کے روز چڑیا گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے۔"

"کتنے میں ملے گا؟" افسر اعلیٰ نے فوراً کہا۔

"وہ انسان ہے جناب۔"

"ہاں آں .... درست۔"

"جناب اگر ہم اسے کسی طور قائل کر لیں کہ وہ صرف جمعہ کی بجائے ہر روز چڑیا گھر آ جایا کرے تو ہمارے ہاں افسرانِ بالا کے حکم کے مطابق میلہ لگ سکتا ہے۔"

"کھاؤں کو تلاش کیا جائے۔" افسر اعلیٰ نے افسرانہ حاکمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

با اعتماد کلرک کو کھاؤں تلاش کرنے میں چنداں دشواری پیش نہ آئی کیونکہ اس روز جمعہ تھا اور کھاؤں حسبِ معمول چڑیا گھر میں گھوم رہا تھا۔

"تم ہی کھاؤں ہو؟" افسر اعلیٰ نے نرمی سے پوچھا۔

"آہو جناب۔"

افسرِ اعلیٰ کی تھوڑی سی گھگھی بندھ گئی کیونکہ اس سے پیشتر اس نے ایسی ڈکراتی

ہوئی خوفناک آواز چڑیا گھر میں بھی نہیں سنی تھی۔ بہر حال اس نے خطا ہوتے اوسان بحال کئے اور نہایت دوستانہ لہجے میں کہا "دیکھو کھاؤں، اگر تم وعدہ کرو کہ ہر روز چڑیا گھر آؤ گے، بلا ناغہ، تو ہم تم سے داخلے کے پیسے وصول نہیں کیا کریں گے۔"

کھاؤں جو بڑے اطمینان سے چڑیا گھر کی سیر میں محو تھا اور جسے با اعتماد کلرک باقاعدہ ورغلا کر دفتر میں لے آیا تھا قدرے خوفزدہ تھا کہ شاید اس نے کسی بندر کو جو اپنی باسی روٹی کھلا دی تھی اس کی پاداش میں اس کی یوں پیشی ہو گئی ہے اب ایک گہرا سانس لے کر بولا "پر جناب میں تے مجوری کرناں — میں کیویں آواں روز روز"

اس پر با اعتماد کلرک اور افسر اعلیٰ نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی اور پھر با اعتماد کلرک کھاؤں کے کندھے پر بڑے بے تکلفانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر بولا "تمہیں وہاں کتنی مجوری میرا مطلب ہے مزدوری ملتی ہے؟"

"جی پندراں روپے۔"

"ہم تمہیں تیس ۳۰ روپے دیں گے۔"

کھاؤں پھر خوفزدہ ہو گیا "پر کیوں جی؟"

"اس لئے کہ ہم تمہیں پسند کرتے ہیں —" افسر اعلیٰ نے بھی با اعتماد کلرک کی پیروی کرتے ہوئے کھاؤں کے دوسرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اگرچہ اسے سیاہ گوشت کے اس تودے کو چھوتے ہوئے کراہت سی محسوس ہوئی۔

"پر جی میں تے مستری غلام علی نال پنڈوں آیاں — اوہنوں پچھ لیؤ۔"

"اسے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے —" افسر اعلیٰ نے اس مستری غلام علی کے لئے مزید کراہت محسوس کرتے ہوئے کہا "تمہیں یہاں پر دوگنی مزدوری ملے گی اور تم ایک نادار اور مستحق شخص کی بجائے جلد از جلد صاحبِ ثروت فرد بن کر اپنے گاؤں لوٹ سکو گے۔ کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا؟"

"کوٹ مراد۔"

"تو بس ٹھیک ہے تم ابھی جا کر اپنا سامان لے آؤ۔"

کھاؤں کے دانت دکھائی دیئے پھر اس کے اندر ایک گراری سی چلی اور گھاں گھاں کرتا ایک قہقہہ باہر آگیا۔

افسرِ اعلیٰ اور با اعتماد کلرک ایک دوسرے کے قریب سمٹ آئے کیونکہ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے "ہنستے کیوں ہو؟"

"جی میرا تے سمان ای کوئی نئیں۔ بس ایہہ کپڑے نیں جنّے دے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے کل سے تمہاری ڈیوٹی شروع"

اگلے روز صبح سویرے بندروں کے پنجرے کے قریب ایک چار میٹر × چار میٹر کا پختہ تھڑا تعمیر کیا گیا۔ اس پر کھاؤں کے نام کی تختی نصب کی گئی اور کھاؤں کو بلایا گیا۔

"اس پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ۔"

کھاؤں نے فوراً تعمیل کی اور تھڑے پر چڑھ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

"نہیں درمیان میں بیٹھو۔"

وہ اٹھا اور درمیان میں جا بیٹھا۔

افسرِ اعلیٰ اور با اعتماد کلرک نے تسلّی سے ہاتھ ملے اور جانے لگے۔

"پر جی میں مجوری کی کراں؟" کھاؤں نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" افسرِ اعلیٰ بولا "بس اس تھڑے پر سارا دن بیٹھے رہو اور شام کو تمہیں تیس روپے مل جائیں گے۔"

"پر جی —" کھاؤں تھڑے سے اُتر آیا "میں ویلا نئیں رہ سکدا۔"

"کمال کے آدمی ہو بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔" افسرِ اعلیٰ جھلا گیا اور پھر با اعتماد کلرک کو آنکھ مار کر بولا" — اچھا تو پھر تمہاری مزدوری یہ ہے کہ تم سارا دن تھڑے پر بیٹھ کر ہنستے رہا کرو۔"

"اچھا جی —" کھاؤں قدرے حیرت سے بولا۔

"لیکن ابھی نہیں — جب چڑیا گھر کھلے گا تب۔"

چڑیا گھر کھلا تو کھاؤں ہنسنے لگا — دوپہر تک اس کا گلا بیٹھ گیا منہ خشک

ہو گیا اور اس کا کالا گوشت پسینے سے تر بتر ہو گیا...... وہ رزقِ حلال پر یقین رکھتا تھا۔ اسے یہاں بیٹھنے اور ہنسنے کے پیسے ملتے تھے۔ اس لئے وہ ڈاکرتا رہا زور لگاتا رہا...... اس کی رگیں پھول گئیں اور چہرہ سیاہ ہونے کی وجہ سے سرخ نہیں ہو سکتا تھا مزید سیاہ ہو گیا۔ اور اسی شام جب چڑیا گھر بند ہوا اور جانوروں کو خوراک دینے والے خاکروب نے کھاؤں کے آگے دال کی رکابی اور چند روٹیاں ڈالیں تو وہ جانوروں کی طرح اُن پر پل پڑا۔

یوں کھاؤں کی نئی مجوری شروع ہو گئی۔ وہ رات کو تھڑے پر ہی سو رہتا اور چڑیا گھر کے کھلتے ہی اس کے درمیان ایڑیوں کے بل بیٹھ کر ہنسنے لگتا — شروع شروع میں نزدیکی پنجرے کے بندر بھی اسے چھوٹے بچوں کی طرح دلچسپی سے دیکھتے رہے اور پھر انہیں اس نئے ہمسائے کی عادت ہو گئی۔ کھاؤں کے لئے پہلی رات بقول اس کے بڑی اوکھی تھی کیونکہ طرح طرح کے جانوروں کی آوازیں اس کے لئے دہشت کا سامان بن رہی تھیں۔ اسے خطرے کا احساس ہوا مگر پھر اس نے سوچا کہ خطرہ تو لینٹر کھولتے وقت بھی موجود ہوتا ہے کہ کوئی بھی شہتیر تمہاری کھوپڑی پر گر کر اس کے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ یا مصالحے سے لبریز دابڑے کو اٹھا کر جھولتی ہوئی سیڑھی پر اپنے کیچڑ سے بھرے ہوئے پاؤں کے ساتھ تیسری منزل تک جانا بھی تو خطرناک ہوتا ہے تو پھر طے پایا کہ رزقِ حلال کمانے کی خاطر خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ اور یہاں تو تمام درندے فی الحال پنجروں میں بند تھے — اب اسے ہنسنے کی مشق ہو چکی تھی وہ ہمہ وقت نہیں ہنستا تھا بلکہ جب کبھی بچوں کا کوئی غول اس کے قریب آتا تو وہ انہیں محظوظ کرنے کی خاطر گلے کی رگیں پھلا کر گھا گھا کرنے لگتا...... اس دوران وہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتا رہتا البتہ اس کا قرآنِ پاک چھن چکا تھا۔ ایک صبح وہ حسبِ عادت اس کی عبارت پر انگلیاں پھیر کر اسے پڑھ رہا تھا کہ ایک باریش شخص نے اِسے بے حرمتی ٹھہرا کر مقدس کتاب کو اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا تھا۔

ایک روز کسی شرارتی بچے نے اُسے چھوٹا سا کنکر دے مارا۔ اس نے ماتھے پر

ہاتھ پھیرا اس کا خون بھی سیاہی مائل تھا۔ کھانوں نے اس شام افسر اعلیٰ سے شکایت کی "مینوں بال ڈھیماں ماردے نیں۔ میں کوئی ہلکا یا ہویا گتا تے نئیں۔" افسر اعلیٰ نے متانت سے سر ہلایا اور اگلے روز کھانوں کے نام کی تختی کے سامنے ایک اور تختی نصب کردی گئی "پتھر مارنا منع ہے"...... پھر ایک روز کسی بچے نے اس کے سامنے روٹی کا ایک ٹکڑا پھینک دیا۔ روٹی کا ٹکڑا شام تک وہیں پڑا رہا کھانوں نے اسی شام افسر اعلیٰ سے شکایت کی "میں منگتا تے نئیں مینوں لوک روٹی کیوں پاندے نیں۔" افسر اعلیٰ نے متانت سے سر ہلایا اور اگلے روز نام اور "پتھر مارنا منع ہے" کے پہلو میں ایک تختی اور نصب کردی گئی "کھانوں کو خوراک کھلانا منع ہے"...... اور ایک روز کسی نے یونہی ایک روپے کا نوٹ کھانوں کی طرف پھینک دیا۔ کھانوں کا چہرہ سیاہ ہونے کی وجہ سے سرخ نہ ہو سکا مزید سیاہ ہو گیا۔ اور اس نے اسی شام افسر اعلیٰ سے شکایت کی "میں مجوری کرناں، لوکی میوں اللہ واسطے پیسے کیوں دیندے نیں۔" افسر اعلیٰ کی ذاتی اخلاقیات میں تو یہ نہایت عمدہ بات تھی کہ یوں بیٹھے بٹھائے نوٹ ملتے جائیں بہرحال اس نے پھر متانت سے سر ہلایا اور اگلی صبح ایک اور تختی کا اضافہ ہو گیا "کھانوں کو بھیک دینا منع ہے" اس کے بعد کھانوں ایک مطمئن اور پر امن زندگی بسر کرنے لگا۔ لوگ اسے دیکھنے آتے اور تختیوں پر لکھی ہدایات پر عمل کرتے۔

البتہ کچھ عرصے بعد ایک آسودہ حال خاتون غصے سے سرخ ہوتی ہوئی افسر اعلیٰ کے دفتر میں داخل ہوئی اور یہ خاتون اس لئے سرخ ہو سکتی تھی کہ اس کا رنگ سیاہ نہ تھا بلکہ انتہائی دودھیا اور ملائم سفید تھا۔ خاتون نے اتنی طاقت سے افسر اعلیٰ کی میز پر مکا مارا کہ افسر اعلیٰ جو قدرے غنودگی میں تھا فوراً اچھل پڑا کہ شاید کوئی ببر شیر وغیرہ خوراک کی کمی کی شکایت کرنے بنفسِ نفیس اس کے دفتر میں گھس آیا ہے۔

"جی فرمائیے" افسر اعلیٰ نے آسودہ حال خاتون کے آسودہ چہرے اور آسودہ لباس سے مرعوب ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ نے ایک نہایت خوفناک درندے کو برسرِ عام بٹھا رکھا ہے۔" خاتون گرجیں۔

"درندہ؟" افسر اعلیٰ دوبارہ اچھل پڑا۔

"جی ہاں جسے آپ نے ایک تھڑے پر بٹھا رکھا ہے۔"

"اچھا وہ......" افسر اعلیٰ مسکرایا "محترم خاتون وہ تو کھانوں ہے۔"

"وہ سیاہ اور کریہہ المنظر چیز جو بھی ہے خطرناک ہے۔ اس نے میرے بے بی کو اس طرح گھور کر دیکھا کہ بے چارہ بے بی ابھی تک اَپ سیٹ ہے۔"

"میں اس سے بات کروں گا کہ وہ آئندہ بے بیوں کو گھور کر نہ دیکھے۔"

"بات؟...... اوہ" خاتون نے اوہ کرتے ہوئے اپنی ہتھیلیاں کنپٹیوں پر جمائیں اور آنکھیں پھاڑ کر چھت کی طرف دیکھا "میں کہتی ہوں وہ خطرناک ہے اسے باندھ کر رکھنا چاہیئے زنجیروں وغیرہ سے......"

"لیکن خاتون وہ باقاعدہ جانور تو نہیں کہ اسے...... دیکھئے ہم ایک اور تختی نصب کردیں گے کہ یہ خطرناک ہے۔"

"تختی سے کام نہیں چلے گا۔ کیا چھوٹے بے بی اسے پڑھ سکیں گے......"

"لیکن خاتون......"

"اسے فی الفور زنجیروں سے باندھ دینا چاہیئے۔" خاتون نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے افسر اعلیٰ پر جیسے تھوکا "ورنہ میں آپ کے بڑے افسر سے شکایت کردوں گی آپ جانتے نہیں کہ میں کس کی بیوی ہوں۔؟"

افسر اعلیٰ نے یہ جاننے کی ہرگز کوشش نہ کی کہ خاتون کس کی بیوی ہے اور اسے ایک معقول تجویز قرار دیتے ہوئے فوراً حامی بھر لی۔

یہ وہی دن تھا جب کھانوں کے لئے......

ایک زنجیر لائی گئی۔

"کھانوں یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں؟"

"میں کوئی جناور تے نئیں"

"نہیں نہیں تم انسان ہی ہو جانور تو نہیں لیکن...... لیکن...... لیکن" افسر اعلیٰ

نے زنجیر ڈالنے کے لئے کوئی مناسب قسم کا جواز نہ ملنے پر با اعتماد کلرک کو گھورا جو فوراً گویا ہو گیا "بھئی کھالوں دراصل یہ چبوترہ خطرناک ہے۔ تم اس سے نیچے گر سکتے ہو تمہیں چوٹ لگ سکتی ہے۔"

کھالوں نے ایک فٹ بلند چبوترے کی طرف دیکھا اور گھاں گھاں کرتا ہنسنے لگا "میں تے کدی تو کجی منزل توں نئیں ڈگا۔ ایتھوں کنج ڈگ پواں گا۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "اب کیا کریں؟"

خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد افسرِ اعلیٰ ایک خبیث مسکراہٹ سے لیس ہو کر آگے بڑھا "دیکھو کھالوں ہم دونوں تمہارے دوست ہیں۔ کمال ہے یار دوستوں کی اتنی سی بات نہیں مانتے۔ شاباش۔"

"دوست؟" کھالوں نے منہ کھول دیا "پھیر جیویں آکھو"

با اعتماد کلرک پھرتی سے چبوترے پر چڑھا اور کھالوں کی دونوں پنڈلیوں میں زنجیر ڈال دیں ..... زنجیر کھالوں سے بھی وزنی تھی ..... وہ اپنے دوستوں سے شکایت تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر زنجیر کے بوجھ کی وجہ سے اب وہ ایڑیوں کے بل بیٹھ نہیں سکتا تھا چنانچہ اس نے پھر منہ کھولا "پر جی میں اِنج بیہہ نئیں سکدا۔"

"اگر وزن کی وجہ سے بیٹھنے میں دشواری پیش آ رہی ہے تو بے شک اپنے دونوں ہاتھوں کو استعمال میں لاؤ ... یوں ..." با اعتماد کلرک نے چبوترے پر چڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر جما کر کھالوں کی مشکل آسان کر دی۔

کھالوں نے بھی اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر رکھیں اور سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا "جی اِنج؟" "بالکل" افسرِ اعلیٰ نے خوش ہو کر کہا۔

"جی اِنج تے جنور بہندے نیں" کھالوں نے پُرتشویش لہجے میں کہا

"بالکل جانور اسی طرح بیٹھتے ہیں اور اسی لئے اتنے آرام سے رہتے ہیں ...... فکر نہ کرو تمہیں عادت ہو جائے گی۔"

کھالوں کو زنجیر کی عادت ہو گئی۔

اسے جانوروں کی طرح بیٹھنے کی بھی عادت ہو گئی۔

وہ حوائج ضروریہ کے لئے بھی اُٹھ کر نہیں جا سکتا تھا اس لئے ایک خاکروب چبوترے کی صفائی پر مامور کر دیا گیا۔

اب وہ پلید رہتا تھا۔ مقدس کتاب کے بعد نماز بھی چھن گئی۔

چڑیا گھر کھلتا تو بچوں اور بڑوں کے غول اس کے چبوترے کے گرد ہو جاتے وہ سر اٹھاتا اور ہنسنے لگتا۔ اس کی آواز مزید گھگھیا چکی تھی اور گلا اس طور پھول چکا تھا کہ اکثر اوقات گمان ہوتا کہ وہ ہنس نہیں رہا بھونک رہا ہے ..... اس کی ہتھیلیاں اب تلووں کی طرح سخت ہو چکی تھیں زمین کے ساتھ جیسے جڑ چکی تھیں۔ پہلے پہل یوں کھڑا ہونے سے اس کی کمر میں شدید درد ہوتا تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی سر انجام دینے کے بعد رات کے وقت تھوڑی دیر کے لئے دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر اگلے زمانوں کی طرح کھڑا ہو کر آرام کر لیتا پھر آہستہ آہستہ اسے صرف دونوں پاؤں پر کھڑے ہونے میں دِقت محسوس ہونے لگی اور ایک رات کھالوں جب حسب معمول آرام کرنے کی خاطر اپنے ہاتھ زمین سے اٹھانے لگا تو اس کی کمر میں اذیت ناک درد کا ایک جھٹکا سا لگا اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کی مگر اس کے ہاتھ زمین سے جدا نہ ہو پائے، اگر ہوتے تو ان کی جگہ اس کا منہ جا گرتا۔ اس نے صرف ایک ہاتھ زمین سے اوپر کرنے کی کوشش کی مگر وہ پھر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور گر گیا ...... اگلی صبح کھالوں کی آنکھیں سُرخ تھیں اس لئے کہ وہ سیاہ نہ تھیں اس لئے سُرخ ہو سکتی تھیں۔

کھالوں کو روزانہ تیس روپے رزقِ حلال کی صورت میں ملتے رہے۔ وہ ہنستا رہا اور اپنے خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے اسے دو کی بجائے چار پاؤں لگا دیئے تھے۔

پھر ایک اور سرکلر آ گیا۔

"جلدی جلدی۔ ہمارے چڑیا گھر کے بہترین جانور، اونٹ، ہاتھی، شیر، مگرمچھ،

سانپ بندر وغیرہ ... فوراً — افسرِ اعلیٰ ایک ہذیانی کیفیت میں مبتلا نظر آتا تھا۔
"انہیں فوراً پورٹ ایبل پنجروں میں بند کیا جائے ...... ہم کل صبح روانہ ہو جائیں گے۔"

"مگر کہاں کے لئے؟" با اعتماد کلرک نے بصد ادب دریافت کیا۔
"یہ" افسرِ اعلیٰ نے تازہ سرکلر ہوا میں لہرایا "ملک صرف شہروں کا نام نہیں اس میں دیہات بھی ہیں اور دیہاتی آبادی ان دنوں قدرے ناخوش ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی تفریح کا بھی خیال رکھیں چنانچہ اونٹ ہاتھی شیر......"
"جناب میں سمجھا نہیں" با اعتماد کلرک نے پھر بصد ادب کہا۔
"افسرانِ بالا کا حکم ہے کہ ہم ایک سفری چڑیا گھر ترتیب دیں اور ملک کے دیہات میں جا کر جنگلی جانوروں کی نمائش کریں تاکہ وہاں بھی موج میلے کی ایک کیفیت پیدا کی جا سکے۔ چنانچہ اونٹ، ہاتھی، مگرمچھ، شیر...."
"مگر جناب..... مگرمچھ..... تو نہیں جا سکتے، ان کے لئے پانی درکار ہوتا ہے۔"
"مگرمچھ بنیادی طور پر خشکی کا جانور ہے۔" افسرِ اعلیٰ نے اپنے ماتحت کو

ڈانٹ پلائی۔ ہم انہیں پیک کر کے لے جائیں گے اور ہر گاؤں کے جوہڑ میں چھوڑ دیں گے...."
"بہت عمدہ تجویز ہے جناب" با اعتماد کلرک نے پھر بصد ادب کہا اگرچہ اسے ابھی سے تشویش شروع ہو گئی تھی کہ بعد میں ان مگرمچھوں کو جوہڑوں سے نکالا کس طرح جائے گا ..... اسے معلوم تھا کہ بالآخر یہ کام بھی اُسی کے سپرد ہو گا۔
اگلی صبح جب تمام مقبول ترین درندے پورٹ ایبل پنجروں میں بند کئے جا چکے تھے تو با اعتماد کلرک نے افسرِ اعلیٰ کے کان میں صرف ایک سرگوشی کی۔
"درست بالکل درست ..... اسے بھی پنجرے میں بند کر دیا جائے۔"
"مگر جناب یہ اچھا نہیں لگتا۔ بہرحال وہ اتنا زیادہ جانور تو نہیں ہے۔"

"درست بالکل درست ..... ہمیں انسانی اقدار کی پاسبانی کرنی چاہیئے اس کے لئے زنجیر ہی کافی ہے......"
دیہات میں سفری چڑیا گھر کی دھوم مچ گئی...... ہر گاؤں کے باہر جانوروں کی نمائش ہوتی اور مگرمچھوں کو قریبی جوہڑ میں ڈال دیا جاتا۔ کسان اور مزدور پیشہ لوگ اپنے کام کاج ترک کر کے بھنگڑا ڈالتے ہوئے اس نئے میلے میں شرکت کے لئے آتے اور کھاد کی کمی پانی کی کمی آزادی کی کمی وغیرہ کو چند لمحوں کے لئے بھلا دیتے۔ اگلی صبح مگرمچھوں کو جوہڑوں میں سے نکالا جاتا اور ہر دفعہ ایک آدھ مگرمچھ کم ہوتا اور سفر جاری رہتا..... سفری چڑیا گھر کا تجربہ کامیاب ہو رہا تھا۔ دیہات میں بے چینی کا گراف وقتی طور پر کم ہو رہا تھا..... البتہ افسرِ اعلیٰ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ اگرچہ اونٹ ہاتھی مگرمچھ وغیرہ بڑے ہٹ جا رہے تھے مگر کھالوں کے چبوترے کے پاس بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے تھے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ دیہات کے اکثر نوجوانوں کی شکلیں کھالوں سے ملتی جلتی تھیں اور انہیں اپنے جیسے ہی کسی جانور کو دیکھنے میں دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کی آنکھوں میں قدرے ناپسندیدگی کے جذبات تھے .... شاید کھالوں کے لئے، شاید افسرِ اعلیٰ کے لئے ..... کھالوں ان نوجوانوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا اور جب بھی وہ اوپر دیکھتا اسے اپنی تصویریں حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ اس نے ہنسنا ترک کر دیا۔ اب بھی رزقِ حلال پر اس کا پختہ ایمان تھا مگر سفر کے ساتھ ساتھ، نوجوانوں کے چہروں نے، زمینوں کی قربت نے، کھیتوں کی باس نے اس کے سیاہ جثے کو ایک عجیب طرح کی بے چینی کے قریب کر دیا جو اس پر ایک آری کی طرح چلنے لگی، کھالوں کے اس دماغ پر جس میں بھس بھرا ہوا تھا چنگاریوں کی صورت گرنے لگی..... اب وہ اپنے آگے رکھی ہوئی خوراک کو بھی منہ نہ لگاتا اور بھوکا بیٹھا رہتا، نگران عملہ چپکے سے یہ خوراک چٹ کر جاتا کہ وہ بہرحال انسانی خوراک تھی۔
مسلسل فاقوں سے کھالوں کا وزن کم ہونے لگا۔ اس کے بدن کی سیاہ زمین میں

دراڑیں پڑ گئیں۔ آنکھوں کی پھرکیوں کی حرکت مدھم ہونے لگی..... افسرِ اعلیٰ اور با اعتماد کلرک اپنی بے مثال کامیابی پر اتنے پرمسرت تھے کہ انہیں کھالوں کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

ایک روز کھالوں نے اپنی اصلی ٹانگ ہلائی، زنجیر جو ہمیشہ پنڈلیوں سے اوپر پھنسی رہتی تھی ایک چھناکے سے ٹخنوں پر آگری......

اسی شام قریب سے گزرتے علاقے کے کسی شخص نے اس کے گاؤں کوٹ مراد کا نام لیا "کوٹ مراد؟" کھالوں نے زمین میں پیوست ہتھیلیوں کو اٹھانے کی کوشش کی اور حسبِ معمول منہ کے بل گر گیا۔ وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ ایک خاکروب جب رات کے کھانے کی رکابی اس کے آگے رکھنے آیا تو کھالوں نے وہیں پڑے پڑے پوچھا

"بھائی جی کل ساڈھا پڑی گھر کیہڑے پنڈ جائے گا؟"

"کل کوٹ مراد میں جانوروں کی نمائش لگے گی۔" خاکروب نے جاتے جاتے جواب دیا۔ کھالوں کے دماغ میں بھرا تمام تر بھس سلگنے لگا۔

"کھالوں"

"پتھر مارنا منع ہے۔"

"کھالوں کو خوراک کھلانا منع ہے۔"

"کھالوں کو بھیک دینا منع ہے"

"کھالوں یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں؟"

"میں کوئی جنورتے نئیں۔"

میں جنورتے نئیں.... میں جنورتے نئیں۔ کھالوں کے اندر بے شمار گراریاں سی چلنے لگیں اور ان میں سے ایک گھا گھا کرتی آواز آئی میں جنورتے نئیں۔ اس شور میں ایک کالی کوئل کوکتی، کوٹ مراد۔ کوٹ مراد..... نصف شب کے قریب کھالوں نے زور لگا کر پاؤں کھینچے تو ٹخنوں کے گرد گوشت کو چھیلتی ہوئی زنجیر کی اذیت نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ "کوٹ مراد" کالی کوئل کوکی اور اس نے اپنے بھدے ہونٹ

بھینچ کر پھر زور لگایا "کوٹ مراد" کوئل کوکی اور اس کے کالے بدن سے پسینے پانی کی طرح بہنے لگے...... "کوٹ مراد" اس کا بدن کوکنے لگا۔ اور اس نے پھر زور لگایا اور ٹخنوں کے اوپر کا گوشت چھلتا چلا گیا۔ خون کی رطوبت نے زنجیر کی سختی کو نرم کیا اور کھالوں منہ کے بل گر گیا۔ لیکن وہ اس مقام سے ایک ہاتھ آگے جا کر گرا جہاں پر وہ ہمیشہ گرتا تھا، زنجیر اور اس کے پاؤں کے درمیان بھی ایک ہاتھ کا فاصلہ تھا..... وہ رینگتا ہوا چبوترے سے اُترا۔ سفری چڑیا گھر کے میدان سے باہر آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چاروں "پاؤں" پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس حالت میں وہ مدتوں بیٹھا رہا تھا مگر اس طور چلنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اگلے زمانوں میں وہ زمین کو بلندی سے دیکھتا تھا اور آج وہ اس پر ناک کو رگڑتا ہوا چل رہا تھا..... اس کی ہتھیلیاں تو پاؤں کے تلووں کی مانند سخت ہو چکی تھیں مگر جنگلی گھاس اس کے نتھنوں کو چھید رہی تھی اور اسے سامنے دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور سامنے صرف گھاس تھی..... وہ تیز تیز بھاگنے لگا۔ سرکنڈوں کی تیز دھاریں اس کے جسم پر اذیت کی لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ ہر سرکنڈا اس پسینے اور خون میں ڈوبے ہوئے سیاہ بھاگتے ہوئے بدن کی کمر کے گرد بندھے ہوئے مختصر کپڑے کی ایک دھجی اپنی نوک سے اچک لیتا تا آنکہ یہ پسینے اور خون میں ڈوبا ہوا سیاہ جسم صرف ایک جسم نظر آنے لگا۔ بھاگتا ہوا زبان نکالے، سانس کے لئے ہونکتا ہوا بھاگتا ہوا..... گھاس اور سرکنڈوں کا میدان ختم ہو گیا۔ آگے ایک سوکھا ہوا راجباہ تھا۔ وہ پاؤں جما جما کر نیچے اُترا اور پھر دوسرے کنارے پر چڑھنے لگا۔ راجباہ عبور کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ جنگلی گھاس اور سرکنڈوں کا میدان ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک سبز نرمی ہے جو اس کے جسم کے گرد پھیل رہی ہے۔ اس کے پاؤں تلے مٹی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہتھیلیوں کو زمین کی گرفت سے آزاد کرنے کے لئے زور لگایا اور ایک مرتبہ پھر اوندھے منہ گر گیا۔

اس کی ناک بھربھری مٹی میں دھنس گئی اور اس کے کھلے منہ کو بھی مٹی نے پُر کر دیا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے ہتھیلیاں کھول کر زمین پر رکھیں، انہیں مٹی سے آشنا

کیا وہ تھکا ہوا اسی حالت میں اوندھے منہ پڑا رہا..... پھر اس کے نتھنے ایک پیاسے پرندے کی طرح پھڑپھڑائے اور اس نے ایک طویل سانس لیا، باریک مٹی اور اس کی باس ہوا کے ساتھ مِل کر ایک مٹیالی دُھند کی صورت اس کے بدن میں اُتری اور شریانوں میں پھیلتی گئی۔ اس نے گرد آلود لبوں پر زبان پھیری اور اس کا حلق اپنی مٹی کے ذائقے کی پہچان سے آشنا ہوا..... اس کا بدن مٹی تھا اور اس کا رنگ مٹی کا رنگ تھا..... گندم کی بالیاں اس کے سر پر سرسرا رہی تھیں اور یہ بالیاں اس کے بدن کی مٹی میں سے پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے ایک اور گہرا سانس لیا اور سر اٹھایا اور پھر جس طرح اس کی ماں نے سکھایا تھا۔ اور جس طرح کہ اس کی مٹی نے بتایا تھا اور جس طرح کہ وہ ہمیشہ سے تھا۔ اور جس طرح وہ بدن بلا تردّد اس کا کہنا مانتا تھا اس نے مٹی سے بھری ہتھیلیاں اٹھائیں اور سیدھا کھڑا ہو گیا..... سامنے کوٹ مراد تھا۔

آؤ

روح کو یخ کر دینے والی ایک تاریک آواز قبرستان میانی صاحب کی نئی پرانی قبروں اور گرد آلود کتبوں، پتّوں اور سوکھی ہوئی ٹہنیوں میں سفر کرتی گئی... "آؤ"

"کہاں آؤ؟" میں ہڑبڑا کر سنگِ مرمر کی سِل پر سے اُٹھ بیٹھا جو میری نشست تھی اور مجھے شاید یقین ہوا کہ یہ آواز اس کی ہے جو اس سِل کے نیچے دفن ہے اس پر میرا بوجھ پڑا تو پکار اٹھا کہ آؤ ....

وہ آہستہ آہستہ چلتا آ رہا تھا اور اپنے سامنے دیکھتا تھا۔ اس کے سر پر ایک دائرہ تھا۔ دھوتی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ باریش تھا، دیوانہ لگتا نہیں تھا اور یہی تھا جو بلاتا تھا، آواز دیتا تھا کہ آؤ..... پر پتہ نہیں کس کو آواز دیتا تھا.... ان کو جو اس قبرستان میں دفن تھے یا ان کو جو اس قبرستان کے اوپر تھے اور یہ انہیں بلاتا تھا جو بھول چکے تھے کہ کبھی بلاوا آئے گا اور یہ بلا رہا تھا، موت

کی طرح بلا رہا تھا۔ "آؤ" "یہ آؤ" وہ ایک خاص انداز میں کہتا، ایک ایسا انداز جس میں کچھ کچھ غراہٹ اور حملہ آور ہونے کی کیفیت تھی، اگر یہ شخص رات گئے گھر واپسی پر آپ کے کان میں اسی طرح ایک عدد "آؤ" پکار دے تو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے شدید امکانات ہو سکتے تھے۔

میں اس روز میانی صاحب میں تھا.... من مرضی سے نہیں گیا تھا کیونکہ انسان اگر قبرستان جاتا ہے تو صرف دو صورتوں میں.... پہلی یہ کہ وہ کسی کو کندھا دیتے دیتے وہاں پہنچ جاتا ہے اور دوسری وہی جس سے وہ بھاگتا بہت ہے مگر پکڑا جاتا ہے یعنی لوگ اسے کندھا دے کر وہاں پہنچا دیتے ہیں..... اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے کوئی بہت بڑا دماغ نہیں چاہیئے کہ میں پہلی صورت کی وجہ سے وہاں تھا۔ اگر دوسری صورت کی وجہ سے ہوتا تو یہ لکھنے لکھانے کا فریضہ میں نہیں بلکہ میرے دوست احباب سرانجام دے رہے ہوتے کہ آہ عجب بیزار مرد تھا..... بہرحال میں ایک دوست کی والدہ کے جنازے کے ہمراہ قبرستان میانی صاحب پہنچا تھا.... پہلی مرتبہ قبر کھودی گئی تو لواحقین کو اس کا ڈیزائن پسند نہ آیا۔ دوسری مرتبہ اس میں کوئی تیکنیکی خامی رہ گئی، چنانچہ اب گورکن حضرات بیلچوں سے بھُربھری مٹی کو پھینکتے ہوئے وہ خامی دور کر رہے تھے، اور جنازے کے ساتھ آئے ہوئے بیشتر حضرات آنکھ بچا کر گھڑیوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے چپکے چپکے کھسک رہے تھے۔ وہ اُس راستے سے کھسک رہے تھے جہاں پر بڑی بی ٹھنڈی پڑی تھیں اور اکیلی پڑی تھیں کیونکہ بیٹے اور پوتے، قبر کی تیکنیکی خامی دور کروانے میں مگن تھے اور اس طرح مگن تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہماری والدہ نے کون سا روز روز مرنا ہے قبر تو ڈھنگ کی ہونی چاہیئے..... میں بھی اسی سوچ میں تھا کہ کوئی دیکھ تو رہا نہیں، حاضری تو لگ گئی اس لئے یہاں سے چل ہی دینا چاہیئے۔ اور یہ وہی وقت تھا جب دل کو ٹھنڈا کر دینے والی یہ آواز قبرستان میانی صاحب کی نئی پرانی قبروں اور گرد آلو کتبوں، پتّوں، سوکھی ٹہنیوں میں سفر کرتی مجھ تک آئی.... "آؤ" اس آواز میں ایک حیوانی غراہٹ بھی تھی۔ جو لاکھوں قبروں پر

گونجتی تھی.... "آؤ" سر پر ایک دائرہ جس کے کناروں سے چھیچھڑے لٹک رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے آگے لٹک رہے تھے، جیسے جھالریں ہوں.... "آؤ"

اور پھر وہ آنے لگے، جنہیں وہ "آؤ" کہہ کر بلاتا تھا۔

بیٹھی ہوئی قبروں میں سے، گرد آلود مقاموں میں سے، دھنستے ہوئے تالابوں میں سے، ان راستوں پر سے جو پتہ نہیں کہاں سے آتے تھے.... وہ آئے... بلیوں کے سر نمودار ہوئے.... سینکڑوں کی تعداد میں غراتی بلیاں اور پھر کُتے آئے۔ سونگھتے دُمیں ہلاتے.... درجنوں کی تعداد میں..... اور پھر ہمارے اوپر کوّے شور مچانے لگے۔ ایک گِدھ اپنے ہی بوجھ تلے دبتا نیچے ہوا اور کیکر پر بیٹھ کر گردن کھینچتا گیا.....

تب اس شخص نے سر سے دائرہ اُتارا، جس کے کناروں سے چھیچھڑوں کی جھالریں لٹکتی تھیں، اسے ایک قبر پر رکھا اور اس میں سے چھیچھڑے نکال نکال کر کچی پکی قبروں پر اور ان کی درمیانی جگہوں پر اور کتبوں پر پھینکنے لگا.... "آؤ" وہ پکارتا جاتا اور وہ آتے ہی گئے۔ وہ آتے اور اسے چھیچھڑے پھیلاتے ہوئے دیکھتے اور کھڑے ہو جاتے، غراتے رہتے، دُمیں ہلاتے مگر چھیچھڑوں کو منہ نہ لگاتے بس کھڑے رہتے اور وہ ان کو چھوٹی بڑی کچی پکی قبروں پر پھیلاتا اور.... "آؤ".... "آؤ"... جب دائرہ خالی ہو گیا تو اس نے ایک کچے برتن میں پانی بھرا اور ان کے درمیان رکھ دیا.... تب اس نے ایک اور "آؤ" کہا جو پہلے "آؤ" سے مختلف تھا۔ دھیما اور آخری جیسے اجازت نامہ ہو اور وہ سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھے، حرکت کی اور دُمیں ہلاتے، غراتے اس ضیافت سے لطف اندوز ہونے لگے؛ اور وہ اس طرح نہیں کھا رہے تھے جیسے ہم لوگ باراتوں میں کھاتے ہیں انسانوں اور وحشیوں کی طرح بلکہ جانوروں کی طرح کھا رہے تھے، تحمل سے اور اطمینان سے۔

"یہ قبروں پر چھیچھڑے کس نے پھینکے ہیں؟" ایک صاحب جو قبر کے ڈیزائن کی نگرانی کر رہے تھے، سستانے کی غرض سے ادھر آئے اور کتوں، بلیوں اور کوّوں کو قبروں پر چہل قدمی کرتے اور کھاتے پیتے دیکھا تو وہ بھی غرائے.....

کس نے پھینکے ہیں؟"

"میں نے ..." اس شخص نے اطمینان سے کہا' وہ دھوتی کے پلّو سے ماتھے کو پونچھتا ہوا بولا تھا۔

"گندے چھیچھڑے قبروں پر پھینکتے ہو ..." وہ صاحب پھر غرّائے ..... "اس طرح قبروں کی بے حُرمتی ہوتی ہے۔"

"لو" وہ میری جانب دیکھ کر بولا" وہ تو بولتے نہیں جو قبروں میں ہیں اور یہ بولتا ہے۔"

"اٹھاؤ ان کو ..." وہ صاحب اپنی داڑھی کو مٹھی میں دباتے ہوئے اُبلے۔

"آؤ" اس نے ان صاحب پر ایک نگاہ ڈالی اور نعرہ لگایا ...

وہ صاحب تھوڑے سے لرزے اور بڑبڑاتے ہوئے قبر کی طرف چلے گئے۔

"جب تمہاری قبر ہوگی تو اس پر نہیں پھینکوں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا" قبروں والے اعتراض نہیں کرتے، یہ کرتا ہے ...." وہ اٹھا اور ایسے چھیچھڑے جو مٹی میں لتھڑ گئے تھے اور جانوروں کو نظر نہیں آتے تھے اٹھا اٹھا کر ان کے آگے ڈالنے لگا۔

"کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"درزی ہوں، کپڑے سیتا ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔

"اور یہ کام ...."

"بابے مجنوں نے کہا تھا کہ بیٹے جانوروں کو خوش رکھو۔"

"کب کہا تھا؟"

"پچاس سال پہلے .... اور تب سے اب تک۔"

میں نے قبر کی جانب نگاہ کی اور اندازہ لگایا کہ ابھی کچھ وقت لگے گا میرے دوست کے بھائی بھی بور ہو کر ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ان کی چار بجے کی چائے کا وقت ہو رہا تھا چنانچہ میں نے اس بابے کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

"میں بس ابھی گیلا گیلا ہی تھا کہ ماں مجھے بابے مجنوں کے پاس اٹھا لائی ..."

وہ کتوں کے تیزی سے چلتے جبڑوں اور بلیوں کے گلے کی رگوں کو دیکھتا تھا اور بولتا

"میں ذرا سا بڑا ہوا تو ماں مر گئی، پھر بابا مجنوں مرنے لگا تو میں نے روتے ہوئے کہا بابا جی میں آپ کی خدمت نہیں کر سکا، کوئی خدمت بتائیے .... بابا جی نے یہ خدمت بتا دی۔ اب پچھلے پچاس برس سے صبح اور دوپہر آتا ہوں۔ محلے اور بازار کے قصاب میرے لئے چھیچھڑے رکھ چھوڑتے ہیں اور میں جمع کر کے لے آتا ہوں ...."

"اور جس روز گوشت کا ناغہ ہوتا ہے، تب کیا کرتے ہو، کتوں کو سبزیاں کھلاتے ہو ...؟"

اس نے اس سوال میں چھپی خباثت کو محسوس کیا اور بولا" مرغے تو ہوتے ہیں ناں۔ کبھی کھائے ہیں؟"

"کوئی بال بچہ بھی ہے؟"

"آہو .... دو بیٹے ہیں۔ ایک کو میں ساتھ لاتا تھا۔ دو مہینے ہوئے وہ کراچی بھاگ گیا نامائیم کا بچہ، کہتا تھا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ روزانہ چھیچھڑوں سے بھرا ہوا دابڑہ اٹھایا اور مُردوں کے گھروں میں جا کر جھانکنا شروع کر دیا .... اسے کیا پتہ بابا مجنوں کیا تھا۔"

"اور یہ جانور تمہاری آواز پہچانتے ہیں؟"

"آہو .... جہاں کہیں ہوں آ جاتے ہیں .... میرے تین چار اڈے ہیں .... یہ پہلا ہے۔ ایک اڈے پر تو میری سرکار نیولے بھی آتے ہیں، اور قبروں میں رہنے والے ایسے ایسے جانور، ایسی مخلوق کہ بس .... دیکھو تو حیران ہو جاؤ .... مُردے کھانے والے ہوتے ہیں .... اس لئے جس دن مُردے کم آئیں تو وہ زیادہ بھوکے ہوتے ہیں۔"

گرمی کے باوجود میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک برفیلی کیفیت اثر کرنے لگی، بلیوں کی غرّاہٹ کم ہو گئی، شاید ان کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔ کتے کچھ سُست ہو رہے تھے۔

اور کوّے آس پاس کے کیکروں پر جا بیٹھے تھے۔ وہ اٹھا اور ان چھچھڑوں کو اٹھانے لگا جو بچ گئے تھے، انہیں دابڑے میں ڈال کر اسے سر پر اٹھایا اور آواز دی "آؤ"....

بلّیاں اِن راستوں پر واپس ہوئیں جہاں سے آئی تھیں، کتّے بھی دُمیں ہلاتے روپوش ہو گئے اور کوّے بھی اُڑ گئے۔

"بابے مجنوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ انسانوں کو بھی خوش رکھو.... انسان بھی تو بھوکے ہوتے ہیں..... پیاسے ہوتے ہیں۔"

"کیا تم چھچھڑے کھا لوگے....." وہ دابڑے کو تھپک کر بولا۔

"نہیں....لیکن....؟"

"آؤ" اس نے کہا اور ادھر چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔

میرے دوست کی والدہ کی قبر ابھی تک کھودی جا رہی تھی۔ کبھی وہ چوڑی زیادہ ہو جاتی کبھی اس کا زاویہ مذہبی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہو جاتا اور کبھی وہ اندر سے ڈھے جاتی اور مٹی سے پُر ہو جاتی۔ اب میرا دوست بھی اُکتا چکا تھا اور ہر قیمت پر اپنی والدہ کو دفن کر کے گھر کی عافیت کو لوٹنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور ایک اداکار کے اداس اور مغموم چہرے کے ساتھ کوئی بہانہ تراشا اور اجازت لے کر قبرستان سے باہر آ گیا۔

اِس "آؤ" اور اُس "آؤ" کے درمیان زندگی میں بہت کچھ ہوا اور اُس "بہت کچھ" کی تفصیل بیان کرنا اتنا ضروری بھی نہیں، چنانچہ بہت سی راتوں کے بعد کوئی ایک رات تھی۔ میں بستر میں تھا۔ رات کا کوئی سا پہر تھا اور میں سوتا تھا کہ کسی نے سرگوشی کی "آؤ۔"

مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"کون ہے؟" میں نے آواز دی۔

"کون ہے؟" میری بیوی نے اُٹھ کر دریافت کیا۔

"کون ہے؟" بچّوں نے بھی سوال کیا۔

"کوئی بھی نہیں"، میں نے کہا۔

"تو پھر تم خواب میں کہہ رہے تھے کہ آؤ۔ آؤ..." میری بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں یہ مَیں ہی تھا جو آؤ۔ آؤ کہہ رہا تھا۔" میں نے اسے تسلّی دی۔

"کس کو بلا رہے تھے؟"

"کسی کو بھی نہیں" میں نے کہا "تم سو جاؤ۔"

وہ سب سو گئے۔

تب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔

"میں جانوروں کو خوش کرنے کے لئے آیا ہوں چھچھڑے لے کر...." وہ بولا۔

"لیکن یہ میرا گھر ہے، قبرستان تو نہیں ہے۔" میں نے غصّے سے کہا۔

اس کے نیچے قبرستان ہے۔ جہاں مٹی ہے، وہاں ہڈی ہے۔ بس نشان نہیں ہے ورنہ ہم سب قبرستانوں میں ہی تو ہیں.... "آؤ"

میں نے بوکھلا کر اپنے بیوی بچوں کی طرف دیکھا لیکن شاید انہوں نے یہ "آؤ" نہیں سُنا تھا اور وہ اطمینان سے سوتے تھے۔

اس نے دابڑہ سر سے اُتارا اور اس میں سے چھچھڑے نکال نکال کر میرے، میری بیوی اور بچوں کے بستروں پر پھینکنے لگا اور ساتھ ساتھ "آؤ.... آؤ۔"

میرا خیال ہے کہ میں یہ زیادہ پسند نہیں کروں گا کہ تم اکثر میرے گھر آؤ اور پھر "آؤ..... آؤ۔"

"تم اپنے جانوروں کو بھوکا رکھوگے؟" اس نے کہا۔

یہاں کوئی جانور نہیں ہیں"۔ میں نے اپنے غصّے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔

اور تب "وہ" سب آئے جنہیں وہ پکارتا تھا لیکن یہ سب میرے گھر میں کہاں سے آ گئے۔ وہ دروازوں چوکھٹوں اور کھڑکیوں میں سے نکلتے، غرّاتے اور دُمیں ہلاتے ہوئے وہ ہمارے بستروں پر چڑھ کر جبڑے ہلانے لگے..... حیرت کی بات ہے کہ میرے بچوں اور بیوی کو ان کا بوجھ محسوس تک نہیں ہوا، اور وہ مزے سے سوتے رہے۔ البتہ میں

خوفزدہ تھا۔ صبح کی اذان ہوئی تو میرا خیال تھا کہ اب وہ خوفزدہ ہوں گے۔ لیکن وہ اس طرح جبڑے ہلاتے رہے.... کھڑکیوں کے باہر چیزیں ظاہر ہونے لگیں تو وہ سب چلے گئے۔ اس نے اپنا دابڑہ اٹھایا "آؤ" کہا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

اگلے روز میری بیوی شکایت کر رہی تھی کہ ہماری سفید چادروں اور صاف ستھری رضائیوں پر خون کے نشان تھے۔ اور اس قسم کی بو تھی جو سڑک کے نیچے کچلے جانیوالے جانور کے قیمہ شدہ گوشت سے آتی ہے۔

پھر اس "آؤ" اور اُس "آؤ" کے درمیان زندگی میں بہت کچھ ہوا اور اس "بہت کچھ" کی تفصیل بیان کرنا اتنا ضروری بھی نہیں، چنانچہ بہت سارے دنوں کے بعد کوئی دن تھا۔ میں اپنی کار میں تھا۔ باہر صبح کی دھوپ تھی، میں ٹریفک کے اس اژدھے کا ایک حصہ تھا؛ جو شہر کی سب سے بڑی سڑک پر پھنکار رہا تھا، شور تھا جو کانوں میں پگھلتا ہوا اترتا تھا۔ کاریں جو جا رہی تھیں ان کی گردنیں برابر تھیں۔ اور وہ ایک دوسرے سے آگے ہونے کی کوشش میں تھیں۔ کاریں جو آ رہی تھیں بھینسوں کی طرح اُمڈی آتی تھیں۔ ہارن بجتے تھے اور ٹائر چیختے تھے۔ اور لوگ تھے جو اپنے کاموں کو جاتے تھے اور باتیں کرتے تھے اور ان باتوں کا بھی شور تھا.... تب اس سارے شور میں کسی نے کہا

"آؤ"

اور میں نے کہا، بھائی میرے تم یہاں بھی آ گئے ہو۔ بھئی یہ شہر ہے قبرستان نہیں اور یہ انسان ہیں کتے اور بلیاں نہیں، تم اپنا چھچھڑوں سے لبریز دابڑہ اٹھا کر یہاں بھی آ گئے ہو..... یہاں بھی آ گئے ہو۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں خود کو سُن رہا ہوں جو کہہ رہا ہوں بہت بلند آواز میں کہہ رہا ہوں اور صرف میری آواز ہے جو شہر کی بڑی سڑک پر گونجتی ہے اور باقی خاموشی ہے.... جی ہاں وہی خاموشی جس میں سوئی گرے تو بھی آواز آ جاتی ہے اور اس خاموشی میں میں بولتا تھا کہ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو، یہاں انسان ہیں، حیوان نہیں.... میں نے سوچا یہ خاموشی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہو نہ ہو میرے کانوں کا قصور ہے لیکن قصور اگر کانوں کا ہوتا تو پھر میں خود کو

بھی نہ سُنتا..... ہو سکتا ہے کار کے شیشے بند ہیں اس لئے۔ چنانچہ کار کے شیشے کھولتا ہوں تو خاموشی ہی بہتی ہوئی اندر آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں اور باہر آتا ہوں۔ باہر ٹریفک کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے یا کسی نے اسے پتھر کر دیا ہے۔ کاریں رُکی ہوئی ہیں۔ لوگ چل پھر رہے ہیں لیکن باتیں نہیں کر رہے بلکہ کچھ دیکھنے اور کچھ سننے کی جستجو میں ہیں۔ ایک غراتا ہوا "آؤ" شہر کی سب سے بڑی سڑک پر گونجا اور میں نے پھر کہا کہ میاں صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں، کیا چاہتے ہیں یہاں انسان ہیں حیوان نہیں....

اس نے میری بات پر کان نہیں دھرا، دھیان نہیں دیا اور دابڑے میں سے چھچھڑے نکال نکال کر چوک میں بکھیرنے لگا.... "آؤ"

کہاں سے آئیں گے کتے اور بلیاں اور کوّے اور وہ جو مُردے کھاتے ہیں۔ عمارتوں میں سے نکلیں گے! سڑک میں سے پھوٹیں گے؟ آسمان سے ٹپکیں گے؟ کہاں سے آئیں گے؟

لوگ اس کے پاس جمع ہوتے رہے.... "آؤ"

ہجوم زیادہ ہو گیا اور اس میں شہر کے سبھی طبقے تھے۔ ظالم بھی مظلوم بھی تھے۔ حاکم بھی تھے، محکوم بھی تھے۔ وردی والے بھی تھے اور بغیر وردی والے بھی تھے....

جب اس کا دابڑہ خالی ہو گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے پھر کہا کہ ہمارے کتے اور بلیاں قبرستان میں ہیں۔ وہ مُردے کھانے والے قبروں میں ہیں۔ یہاں تک کیسے آئیں گے، وہیں جاؤ۔

اس نے خاموشی کو سُنا اور پھر اس خاموشی میں آواز دی "آؤ"

مُردہ مینڈک ایسی آنکھوں والا شخص آگے آیا.... اس نے ایک چھچھڑا اٹھایا، منہ میں ڈالا اور جبڑے چلانے لگا۔

ایک شخص شہر کی سب سے قیمتی کار میں سے اُترا الیں ٹیکا تا زمین پر بیٹھا اور پھر گھٹنے ٹیک کر ہتھیلیوں کے بل چلتا چلتا چھچھڑوں کے پاس پہنچ گیا۔ لمبے چوغے والا ایک آدمی اپنی دستار سنبھالتا آگے آیا۔

"آؤ"

چند لمحوں میں بے شمار جبڑے چل رہے تھے گردن کی رگیں پھولتی تھیں اور اس خاموشی میں ایک ہلکی ہلکی غراہٹ چلتی تھی۔

"آؤ" اس کی آواز آئی۔

"میں اب تم سے کہہ رہا ہوں" وہ میرے قریب آگیا۔ "لو تم بھی آؤ... کھاؤ"۔

میں نے اپنے قدموں میں پڑے چھیچھڑے کو دیکھا۔ پتہ نہیں کس کا خون تھا، کس کے بدن کا حصہ تھا، زبردستی نوچا ہوا لگتا تھا۔ اور خون چوسا ہوا لگتا تھا۔

"نہیں" میں نے سر ہلایا۔

"سب کھا رہے ہیں" وہ مسکرایا "تم بھی کھا لو" اس نے جھک کر ایک چھیچھڑا اُٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔

ٹائم مشین

"میں نے بنالی ہے"۔

"کیا؟"

"وہی عجوبۂ روزگار شے۔ شے نہیں مشین، جسے بناتے بناتے ابھی ابھی اِسی وقت میرا آخری سیاہ بال سفید ہو گیا ہے"۔

"جیکل تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ کہیں تمہارے سر کی سفیدی کا گودا تمہارے دماغ پر اثر انداز تو نہیں ہو گیا؟"

"ہائڈ، میں مذاق نہیں کر رہا..... میں نے ابھی ابھی آخری پیچ کسا ہے... تم فوراً آجاؤ"۔

"فوراً تو نہیں آسکتا۔ میں نے بھی ابھی ابھی اپنے سفید سر پر ہیئر کلر نمبر ۲۴ کا لیپ پوتا ہے... ہدایات پر درج ہے کہ کم از کم آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد بال دھونے چاہئیں ورنہ سیاہ نہ ہو سکیں گے"۔

"ہائڈ تم یقیناً ایک بوڑھے بکرے ہو، ایک سو فیصد کمینے اور گھٹیا انسان.... تم تو کہتے تھے کہ بڑھاپے کے باوجود میرے بال قدرتی طور پر سیاہ ہیں اور میں انہیں ڈائی نہیں کرتا"۔

"آہم.... دراصل..... یار جیکل تمہاری حس مزاح کے طوطے ہمیشہ اُڑے رہتے ہیں، بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا.... میں تو اس وقت آئینے کے سامنے کھڑا اپنے قدرتی

طور پر سیاہ بالوں میں کنگھی کر رہا ہوں اور تمہارا فون سُن رہا ہوں!"

"تو پھر فوراً آجاؤ۔"

"آگیا"

نو سو گیارھویں منزل پر پہنچتے پہنچتے ہانڈ کا سانس پھول گیا۔ اگرچہ وہ لفٹ میں سوار ہو کر یہاں تک آیا تھا لیکن نو سو گیارہ منزلیں نو سو گیارہ منزلیں ہوتی ہیں لفٹ ہو یا نہ ہو۔ وہ ہانپتا ہوا جیکل کے فلیٹ میں داخل ہوا۔

جیکل ایک ہاتھی کے پاس کھڑا تھا۔

"ہاتھی؟" ہانڈ نے اچھل کر کہا۔

جیکل نے ہاتھ میں پکڑا پیچ کس ہاتھی کی توند پر دے مارا۔ اس میں سے ایک "ڈھپ" کی آواز کی بجائے ایک گمبھیر سا "ٹن" برآمد ہوا "لوہے کا ہے۔"

"لوہے کا ہاتھی؟" ہانڈ نے اپنی اُبلتی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ لی مبادا وہ اُبل پڑیں؟

"نہیں یار" جیکل نے اب اپنا پیچ کس ہانڈ کی توند پر مارا جس میں سے حسبِ توقع "ڈھپ" کی آواز آئی۔ ہانڈ درد کی شدّت سے دوہرا ہونے کو تھا کہ اُسے یاد آیا کہ وہ موٹا ہونے کی بنا پر دوہرا نہیں ہو سکتا چنانچہ اس نے ایک واجبی سی "اُف" پر ہی اکتفا کیا۔ "مائی ڈیئر ہانڈ یہ وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو بلکہ یہ وہ ہے جو میں نے بنائی ہے، وہی عجوبۂ روزگار شے ..... شے نہیں مشین جسے بناتے بناتے ابھی ابھی اِسی وقت ..... اِس وقت نہیں تقریباً دس منٹ پیشتر میرا آخری سیاہ بال سفید ہوا ہے ..... تمہیں یہ ہاتھی اس لئے لگ رہی ہے کہ یہ ہے ہی ہاتھی ..... لیکن صرف ظاہر طور پر ..... مائی ڈیئر ہانڈ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر مشین، مشین ہی دکھائی دے، وہ ہاتھی بھی تو دکھائی دے سکتی ہے۔"

"مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو کہ یہ ہاتھی ہے یا مشین؟"

"یہ مشین ہے جسے میں نے ہاتھی کی شکل دی ہے۔ آخر تبدیلی بھی کوئی چیز ہوتی ہے مائی ڈیئر۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" ہانڈ نے اپنے کھولتے ہوئے غصے پر ڈھکن رکھنے کی کوشش کی۔ "یہ ایک مشین ہے جسے تم نے ہاتھی کی شکل میں بنایا ہے مگر کس قسم کی مشین؟"

"ٹائم مشین۔"

ہانڈ کا کھولتا ہوا غصہ ایک کھولتے ہوئے قہقہے کی صورت اُس کے بوڑھے مُنہ سے گاڑھے خیرے کی طرح بہنے لگا "اوئے بوڑھے بکرے، کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا دماغ نہ صرف چل گیا ہے بلکہ چلتا ہوا کچھ زیادہ ہی دُور چلا گیا ہے ..... ایچ جی ویلز کی کتابیں پڑھنے کا یہی اثر ہوتا ہے۔"

"مائی ڈیئر ہانڈ۔" جیکل روہانسا ہو کر بولا "میں اپنی جوانی کے تمام معاشقوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ ہاتھی جو ہے یہ سچ مچ کی ٹائم مشین ہے۔"

"تم وثوق سے کہہ سکتے ہو۔"

"بالکل"

"تم نے اسے آزمایا ہے۔"

"اسی لئے تو تمہیں بلایا ہے۔"

ہانڈ نے فوراً دروازے کا رُخ کر لیا مگر جب وہ باہر قدم رکھنے لگا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے پاؤں سے لپٹی دو رسّیاں اُس کی راہ میں حائل ہیں اور یہ رسّیاں جیکل کے باریک بازو تھے جو اُس کے پاؤں پکڑے فرش پر بیٹھا تھا۔

"پلیز ہانڈ میری مدد کرو ..... اس مشین میں بیٹھ جاؤ اور میں تمہیں پچھلے زمانوں کی سیر کروا دوں گا۔ پلیز ہماری سو سالہ رفاقت کی خاطر"

"کم از کم میرے پاؤں تو چھوڑ دو۔"

جیکل نے اس کے پاؤں چھوڑے تو اس سے بغل گیر ہو گیا اور وہ خاصی دیر تک بغل گیر ہوتا رہا یہاں تک کہ بیچارے ہانڈ کی سانسیں قدرے بے ربط ہونے لگیں۔ یہ بے ربطگی وفورِ جذبات کی وجہ سے ہرگز نہ تھی بلکہ جیکل کے ہاتھوں کے شکنجے کے نتیجے میں وقوع پذیر ہو رہی تھی جو اس کا نظامِ تنفس منقطع کرنے کو تھا۔ جیکل کو جب

اس اندوہناک صورتِ حال کا احساس ہوا تو اُسنے ہانڈ کو فوراً اپنی بغلگیری سے آزاد کر دیا۔ ہانڈ دھم سے فرش پر گر گیا۔

"مائی ڈیئر ہانڈ" جیکل نے جھک کر کہا "تم فی الحال مر نہیں سکتے، تم کوچ کر گئے تو میری ٹائم مشین میں کون بیٹھے گا۔"

ہانڈ لرزتی ہوئی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا "میرے بال ابھی تک قدرتی طور پر سیاہ ہیں، میں فی الحال مرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"ہرّے" جیکل نے نعرہ لگایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہاتھی یعنی مشین کے پاس لے گیا" اس کا آپریشن اتنا آسان ہے کہ اِسے ایک بچہ بھی آپریٹ کر سکتا ہے۔ بٹن نمبر ایک۔ اِس کے گرد دُنیا کے اُن خطوں کے نام درج ہیں جہاں اِس میں بیٹھے ہوئے شخص کو بھیجا جا سکتا ہے۔ بٹن نمبر دو کے گرد جو ہندسے ہیں انہیں دبا کر گذرے ہوئے وقتوں کی طرف ایک اُلٹا سفر اختیار کیا جا سکتا ہے۔"

"بہت ہی دلچسپ مائی ڈیئر جیکل۔"

"مجھے اپنا لیکچر ختم کر لینے دو۔" جیکل جھلا کر بولا "مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اٹھارہویں صدی کے امریکہ میں پہنچنا چاہے تو بٹن نمبر ایک کو" امریکی برّاعظم" پر فکس کیا جائے اور بٹن نمبر دو پر اٹھارہ کے ہندسے کو دبا دیا جائے .... کھل جا سم سم اور تم وہاں ہو گے ...."

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"پرکھنا یقین کرنا ہے۔ آپ میرے مہمان بنئے۔" جیکل نے ہاتھی کے پیٹ میں پوشیدہ ایک آہنی دروازہ کھولتے ہوئے ہانڈ کو دعوت دی۔

"مجھے واقعی یقین نہیں آرہا" ہانڈ بڑبڑاتا ہوا بے دھیانی میں اُس کے اندر جھانکنے لگا اور اُسی لمحے جیکل نے اُسے ایک زور کا دھکا دیا اور دروازے کو مضبوطی سے بند کر دیا۔ ہاتھی بُری طرح ڈولنے لگا، ہانڈ اُس کے اندر اُدھم مچا رہا تھا اور اُس کی چیخ و پکار نے جیکل کو بے پناہ مسرت دی اور وہ ہاتھ ملتا ہوا ایک عیّارانہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر لے آیا۔ چند منٹ بعد ہاتھی پھر سے مستحکم ہو گیا یعنی ہانڈ بے چارہ اب تھک ہار کر اُس

کی توند میں ہانپے جا رہا تھا۔

"میرے عزیز ترین دوست تم کیسے ہو؟" جیکل نے ہاتھی کے پیٹ پر پنچ کس رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ ہاتھی کا اندرونی خلا اِس ضرب سے گونجا اور اُس میں مقید ہانڈ پھر سے اُدھم مچانے لگا۔

"خاموش" جیکل نے جھلا کر ہاتھی کی توند پر پنچ کس کے متعدد وار کئے۔ ہانڈ خوفزدہ ہو کر چُپ ہو گیا۔" مائی ڈیئر ہانڈ اب جبکہ تم ہاتھی کے پیٹ میں قید ہو ہی چکے ہو تو عمدہ اخلاقیات کا یہی تقاضا ہے کہ تم حالات سے سمجھوتہ کر لو۔"

"وہ کیسے؟" ہانڈ کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔

"تم بغیر کسی دھونس اور طاقت کے استعمال کے، اپنے آپ کو ٹائم مشین کے پرکھنے کے لئے ایک گنی پگ یعنی تجرباتی جانور کے طور پر آفر کر دو۔"

"اور اگر میں ایسا کر دوں تو تم وعدہ کرتے ہو کہ مجھے اس قید سے نکال لو گے؟"

"ایک شریف آدمی کا وعدہ۔"

"میں ہانڈ ابنِ ہانڈ بہ قائمیٔ ہوش و حواس اپنے آپ کو بطور گنی پگ والنٹیئر کرتا ہوں اور میں کسی قسم کے دباؤ یا دھونس کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہا۔"

"جالی گڈ" جیکل بے حد راضی ہوا" اب تم یہ بتاؤ کہ تم کونسے ملک میں ماضی کی کس صدی میں جانا پسند کرو گے؟"

"کِس حرامزادے کو پروا ہے۔ تم بس کوئی سا بٹن دبا دو اور اس بلاسٹڈ مشین کو ٹیسٹ کر کے مجھے یہاں سے نِکالو۔"

"غصہ۔ غصہ۔ مائی ڈیئر ہانڈ، بُری بات۔ تمہیں تو یہ صورتِ حال انجائے کرنی چاہیئے۔ بھئی اگر گنی پگ بن ہی گئے ہو تو کم از کم اپنی پسند کے زمانے اور ملک میں سفر کرو۔"

"اگر تمہیں اصرار ہے تو پھر .... تو پھر .... مجھے سوچنے دو ..... اچھا تو پھر مجھے پندرھویں صدی کے پُراسرار مشرق میں بھیج دو۔"

"یہ ہوئی ناں سپورٹس مین سپرٹ مائی ڈیئر ہانڈ ..... تیار ہو جاؤ میں بٹن دبانے کو ہوں

..... نمبر ایک پر اسرار مشرق ..... نمبر دو پندرہ ......"

تب ایک بھونچال سا آیا۔ ہائڈ ہاتھی کے پیٹ میں ایک بے بس پتلے کی طرح لڑھکنے لگا۔ لڑھکنے کے عمل میں اُسے خفیف قسم کی ضربیں بھی آئیں جن کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ عارضی طور پر بیہوش ہوگیا۔

تب جیکل نے اپنے مایہ ناز ہاتھی کے پیٹ پر کان جمایا، اندر خاموشی تھی، کوئی نہ تھا، ہاں ہائڈ تھا لیکن وہ تھا بھی اور نہیں بھی — جیکل ہاتھی کی تعمیر اور اُس کے بعد ہائڈ کے ساتھ دھینگا مُشتی کے باعث خاصا تھک چکا تھا چنانچہ اُس نے کوشش کی کہ وہ فلیٹ میں پڑے ایک بزرگ صوفے کے ننگے سپرنگوں پر نیم دراز ہو جائے، نہ ہو سکا تو صرف دراز ہوگیا۔ وہ ہائڈ کے بارے میں قدرے متفکر تھا کیونکہ وہ دوست تھا۔ بہرحال سائنس کی ترقی اور نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود وہ بلند پایہ آئیڈیل تھے جن پر اس قسم کے کسی نامعقول دوست کو قربان کر دینا کوئی نامناسب یا بیہودہ بات نہ تھی۔ اپنے ضمیر کو کُلی طور پر مطمئن کرنے کے بعد وہ خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگا۔ ایک طویل مدت وہ اِن خرگوشوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا اور جب بالآخر وہ بیدار ہوا تو اُس کے سامنے ہاتھی تھا۔

"ہاتھی؟ یہ ہاتھی میرے کمرے میں کیسے آگیا۔ اُسی لمحے وہ شدید پشیمان ہوا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اُس کے اعصاب اتنے ڈھیلے پڑ گئے تھے کہ اُسے اپنی مایۂ ناز تخلیق بھی یاد نہ رہی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو اِس بھلکڑپن کی سزا کے طور پر دو عدد تھپڑ رسید کئے اور ہاتھی کی طرف بڑھا۔

"اوہ" وہ دوسری مرتبہ پھر اُچھلا کیونکہ اُس کو یہ بھی یاد آگیا تھا کہ اس کا عزیز ز جان دوست اس ہاتھی کے پیٹ میں تھا۔ وہ فوری طور پر اپنے دوست کے لئے بے حد اداس ہوگیا اور ایک سیڑھی کے ذریعے ہاتھی کے کان تک پہنچا اور سرگوشی کی "ہیلو میرے پیارے دوست"۔ لیکن ہاتھی خاموش رہا، یعنی ہائڈ خاموش رہا۔

جیکل مایوس ہو کر سیڑھی سے اُترا اور پھر اُسی بزرگ صوفے پر دراز ہوگیا بلکہ دراز ہونے کو تھا کہ ایک دِل دہلا دینے والا دھماکہ ہوا، اور جب جیکل کے اوسان خطا

ہونے کے بعد بحال ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ دھویں اور لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے درمیان جو کبھی ہاتھی کا جسم تھے ہائڈ اس طرح کھڑا تھا جیسے شترمرغ کا بچہ انڈا توڑ کر اُس کے درمیان میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں دوست فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے اور کافی دیر تک ہوتے رہے۔

"اب میں کبھی رومانوی ہو کر یہ نہیں کہوں گا کہ کاش میں پندرھویں صدی میں پیدا ہوتا۔" ہائڈ نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"میں تو تمہارے لئے اداس ہوگیا تھا" جیکل نے بھی بڑے شدّ و مد سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور میں بھی بیسویں صدی کے لئے اداس ہوگیا تھا — آہ بیسویں صدی۔" ہائڈ نے نتھنے پھُلا کر ایک گہرا سانس لیا "اب میں اپنے زمانے میں سانس لے رہا ہوں، ایک تہذیب یافتہ عہد میں۔"

"اوئے"! یکدم جیکل نے دوستی اور پیار کے تمام تر جذبات فراموش کر کے ہائڈ کا کان پکڑ لیا "کیا تم واقعی پندرھویں صدی کے پُر اسرار مشرق میں پہنچ گئے تھے، پلیز جلدی بتاؤ، کیا واقعی میری ٹائم مشین کام کرتی ہے؟"

"مجھے آرام تو کر لینے دو۔" ہائڈ نے پہلے کان چھڑایا اور پھر ناراض ہو کر بولا "آخر کو مَیں پانچ صدیوں کا طویل فاصلہ طے کر کے گیا تھا اور اب واپس آیا ہوں، قدرے تھک گیا ہوں۔"

جیکل نے اُسے بڑے اہتمام سے بزرگ صوفے کے ننگے سپرنگوں پر بٹھایا اور خود ایک نالائق شاگرد کی طرح اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "جلدی بتاؤ میرے پیارے ہائڈ، میں جاننا چاہتا ہوں، میں جاننا چاہتا ہوں، تم کہاں تھے؟ تم نے کیا دیکھا؟"

ہائڈ نے ماتھے پر زبردستی متعدد بل ڈالے، ایک گہری سانس بھر کر تھکاوٹ اُتاری اور ایک انتہائی سنجیدہ صورت بنا کر کہا — میں نے دیکھا!

میں نے دیکھا۔

پھانسی کے اِن تختوں کو مضبوط سیمنٹ سے تعمیر کرو تاکہ یہ آنے والے کل کا بوجھ

بھی برداشت کرسکیں۔

آنے والے کل نے تو کل آنا تھا اور آج اِن تھڑوں پر کون کھڑا تھا۔

میں نے دیکھا۔

رُومی اکھاڑے میں فی الحال تمام نشستیں خالی تھیں ـــــ تماشہ پچھلے پہر ہونا تھا۔ البتہ بیچ میدان ایک شخص لکڑی کے کل پُرزوں والی ایک مشین نصب کر رہا تھا۔

غیر ملکی سیّاح نے بڑی دلچسپی سے مشین کا معائنہ کیا "جناب مقامی باشندے صاحب ....." اُس نے تیل سے چُپڑے لنگوٹ ملبوس تنومند سیاہ فام سے کہا "یہ مشین کس کام آتی ہے؟"

"جناب عالی" تنومند شخص نے ایک غیر ملکی کو ایک مقامی صنعت میں دلچسپی لیتے دیکھ کر انتہائی مسرت سے ہاتھ مَلے "جنابِ عالی یہ ہمارے اپنے ملک میں بنی ہے۔ آزادی سے پہلے بھی بنی تھی جب آپ جیسے چِٹّے لوگ ہمارے بادشاہ ہوتے تھے۔ پھر جناب عالی اس کی صنعت ختم ہو گئی۔ لوگ بھول بھال گئے کہ یہ صنعت بھی کبھی اِس ملک میں ہوتی تھی۔ پھر جناب اللہ خوش رکھے ہمارے نئے سلطان کو، انہوں نے اِسے کباڑخانے سے نکالا اور پھر سے میدانوں اور چوکوں میں نصب کر دیا.... بڑی کارآمد مشین ہے صاحب جی ....."

"لیکن جناب مقامی باشندے صاحب اِس سے بنتا کیا ہے؟"

"بنتا کیا ہے؟ صاحب جی اِدھر تشریف لائیں... اِدھر... منہ اُدھر کرلیں اب اپنے دونوں ہاتھ اوپر کریں .... شاباش.... اور ٹانگیں اِدھر...."

ایک اچھے سیّاح کی طرح جاننے کی جستجو میں وہ مقامی باشندے کی ہدایات پر عمل کرتا رہا اور جب اُس کا بدن تکلیف کی شدّت سے کھنچنے لگا تب اُسے احساس ہوا کہ وہ مشین کے ساتھ باندھا جا چکا ہے۔ اِس حالت میں کہ وہ تنومند شخص کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا صرف اُس کی آواز سُن سکتا تھا۔

"ہاں تو آپ نے پوچھا تھا کہ اِس مشین سے بنتا کیا ہے؟ .... قیمہ بنتا جی۔ چھِتڑوں کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں۔ بندہ کھسّی ہو جاتا ہے۔ بندے کے کل پُرزے۔

جی جناب، درست جناب، حاضر جناب کہنے لگتے ہیں...." غیر مُلکی قدرے حواس باختہ ہو گیا اور اُس روزِ بد کو کوسنے لگا جب اُس کے دل میں پندرھویں صدی کے نیم وحشی مشرق کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

"کیا مشین یہ تمام عمل خود بخود کرتی ہے؟ یعنی آٹومیٹک ہے؟" سیّاح نے عافیت اِسی میں جانی کہ گفتگو جاری رکھی جائے۔

"نہیں جی اِس کے ساتھ تو بندے کو صرف نتھی کر دیتے ہیں، باقی کام تو جی یہ کرتا ہے...." تنومند شخص کے ہاتھ میں چکناہٹ سے چُور چمڑے کا ایک آلہ تھا جسے اُس نے ہوا میں لہرایا تو ایک چھنکار سی کانوں میں گونجی۔

".... صاحب جی ویسے تو بڑی خواہش ہے کہ کوئی آپ جیسے صاحب کی پُشت ہو سفید سفید۔ اور اُس کا میں قیمہ بناؤں.... اور دُودھیا چھِتڑوں کے خونی چیتھڑے بناؤں.... اور.... پر آپ تو مہمان ہوئے جی۔"

سیّاح نیم بیہوش ہو چکا تھا جب اُسے مشین سے الگ کیا گیا۔

"خواہ مخواہ ڈر گیا ہے چِٹّا باندر...." تنومند شخص بڑبڑایا۔ اُسی لمحے اُس نے دیکھا کہ وہ چِٹّا باندر واقعی سر پر پاؤں رکھے بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا۔ تنومند شخص نے اُسے زور سے پُکارا "صاحب جی تماشہ تو دیکھتے جاؤ۔ تین بجے کا وقت ہے، بعد از نماز.... بڑی دُنیا آئے گی دیکھنے..... جو نہیں دیکھ سکیں گے اُنہیں آوازیں سنوائیں گے لاؤڈ سپیکر، ہائے او میں مر گیا۔ حال اوئے حال اوئے.... ایسے کُرلائے گا جیسے بندہ نہ ہو چھُری تلے بکرا ہو.... دیکھنا تو سہی کہ ہم نے انسان اور جانور کا فرق ختم کر دیا ہے...."

لیکن سیّاح اُس کی آواز کی زد سے باہر جا چکا تھا۔ البتہ یہ فقرہ اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا کہ ہم نے انسان اور جانور کا فرق ختم کر دیا ہے.... ہم نے انسان اور جانور کا فرق ختم کر دیا ہے....

راستوں پر بہت کم لوگ تھے۔ جو تھے جھُکے ہوئے چل رہے تھے تاکہ وہ اپنا راستہ دیکھتے رہیں، صراطِ مستقیم پر چلتے رہیں۔

سیاہ پلکوں میں گھِری مردہ مینڈک ایسی آنکھیں ہر کسی کو گھُور رہی تھیں۔

تاریخی قلعے کی فصیل اتنی چوڑی تھی کہ اُس پر بادشاہ کی رتھ دوڑ سکتی تھی۔

غیر ملکی سیاح کو قدرتی طور پر اِس قسم کی عمارتیں دیکھنے کا شوق تھا چنانچہ وہ اندر داخل ہوگیا ــــ اُسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے دبوچا اور ایک تاریک کوٹھری میں لاکھڑا کیا ــــ سامنے سیاہ پلکوں میں گھری مُردہ مینڈک ایسی آنکھیں تھیں "اِسے کیوں پکڑ لائے ہو؟"

"سَر یہ تانک جھانک کر رہا تھا، ہم نے سمجھا جاسوس ہے۔"

"آپ امریکہ سے آئے ہیں؟" مُردہ آنکھوں نے پوچھا۔

"امریکہ تو ابھی دریافت نہیں ہوا، ابھی تو صرف پندرھویں صدی ہے" سیاح نے لرزتے ہوئے کہا۔ ایک تو اس صدی میں آکر اُسے لرزنا بہت پڑتا تھا۔

مُردہ آنکھیں مزید مُردہ ہوئیں "روس سے آئے ہو؟"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" سیاح نے یونہی سوال اُٹھا دیا۔

"میں؟" مُردہ آنکھوں کی سفید پُتلیاں اندھیرے میں چمکیں۔ "میں اُوپر سے آیا ہوں۔"

سیاح نے کپکپاتی آواز کو قابو میں رکھنے کی سعی کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "دیکھئے میں ایک بے ضرر قسم کا سیاح ہوں، صرف اِس تاریخی قلعے کو دیکھنا چاہتا ہوں"

"میں دِکھاتا ہوں" مُردہ آنکھوں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ایک کوٹھڑی میں قلم تھے۔

"جو لکھا جانا تھا، لکھا جا چکا ــــ اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

ایک کوٹھڑی میں چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے تھے اور دیواروں پر نسوانی نام کھرچے ہوئے تھے۔

"ہم کم از کم اس جگہ مرد اور عورت کو برابری کی سطح پر رکھتے ہیں۔"

ایک کمرے میں ناخنوں کے ڈھیر تھے۔

"ہم طہارت اور پاکیزگی پر یقین رکھتے ہیں، جو لوگ اپنے ناخن خود نہیں کاٹتے تھے ہم نے اُن کے ناخن کھینچ لئے۔"

ایک کمرے میں مصنوعی بالوں کی وِگیں جمع تھیں۔

"پہلے منصفوں کی کھوپڑیاں اِن وِگوں سے ڈھکی رہتی تھیں اور وہ ہماری آواز سُن نہیں سکتے تھے۔ اب صرف ہماری آواز سنتے ہیں۔

ایوانِ خاص میں کھوپڑیوں کا ایک مینار تھا۔

"یہ کھوپڑیاں صرف دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں مسلسل انکار میں حرکت کرتی رہتی تھیں چنانچہ ہم نے اِنہیں شمالاً اور جنوباً بھی گھمایا اور بدقسمتی سے یہ اپنے جسموں سے علیحدہ ہوگئیں۔"

غیر ملکی سیاح جب تاریخی عمارت سے باہر آیا تو اُس نے اپنے تمام ناخن دیکھے، موجود تھے۔ اپنی کھوپڑی کو ٹٹولا، اپنی جگہ پر تھی اور پھر اطمینان سے شہر کی سیر کرنے لگا۔

راستوں پر بہت کم لوگ تھے۔ جو تھے جُھکے ہوئے چل رہے تھے تاکہ وہ اپنا راستہ دیکھتے رہیں، صراطِ مستقیم پہ چلتے رہیں۔

سیاہ پلکوں میں گھری مُردہ مینڈک ایسی آنکھیں ہر کسی کو گھور رہی تھیں۔

اور پھر صبح کا وقت تھا۔ ہر سو نور برس رہا تھا۔ لوگ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے عبادت خانوں کی جانب رواں تھے۔ فضا میں ایک معطّر پاکیزگی تھی اور ایسی طہارت تھی کہ غیر ملکی سیاح بھی اپنے ذاتی رب کی ثنا میں مشغول ہوگیا اور وِرد کرنے لگا پاک ناموں کا اور مقدس تثلیث کا اور اُس کا جسے رُومی حاکموں نے چوروں کے ایک گروہ کے درمیان میخوں سے گاڑ دیا اور اس روحانی فضا میں وہ بھیگتا رہا یہاں تک کہ عبادت گذار اُس معبد کے دروازے میں سے باہر آنے لگے جس کی دیوار کے سائے میں وہ حمد و ثنا میں مشغول تھا۔ عبادت گذار خدائی احکام کی بجا آوری کے بعد سربلند باہر آئے تھے اور اسی لئے انسانوں کی بجائے دیوتاؤں ایسی رعونت سے چل رہے تھے۔ تب اُس عبادت خانے کے متولّی نے کپڑے کی اُس سفید پوٹلی کو دیکھا جو ایک کونے میں رکھی تھی، پوٹلی تھی مگر نرم مٹی کی طرح ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ اُسے کھولا گیا تو .....

تب اُس نے بطنِ مادر سے باہر پہلی صبح دیکھی اور عبادت گذار اُس پر جھکے ہوئے

تھے اور ایک سرائے تھی اور بھوسے کے ڈھیر پر ایک نو مولود بچہ لیٹا تھا اور اُس پر عبادت گذار جھکے ہوئے تھے مگر یہ شہر بیت المقدس نہ تھا لیکن پھر بھی عبادت خانے کے صحن میں ایک پوٹلی تھی اور جب اُسے کھولا گیا تو بطنِ مادر سے باہر اُس نے اپنی پہلی صبح دیکھی اگرچہ وہ ابنِ مریم نہ تھا اور عبادت گذار اُس پر جھکے ہوئے تھے مگر ابنِ مریم تھا کہ سبھی بچے ابنِ مریم ہوتے ہیں کہ اُن کا رب اُنہیں تخلیق کرتا ہے۔

ایک عبادت گذار نے ہاتھ بڑھائے کہ اُسے گود میں اُٹھا لے کہ فرش سخت تھا اور صبح کی خنکی اُس کے ننگے بدن میں نیلاہٹ اُبھار رہی تھی تب متولّی کی اندوہناک چیخ نے غیر ملکی سیّاح کو بھی دہلا کر رکھ دیا۔ "غلاظت"

ایک اور عبادت گذار کا ہاتھ آگے آیا۔

"گندگی اور گناہ"

کچھ اور مہربان ہاتھ آئے مگر سب کو غلاظت۔ گندگی اور گناہ کی چیخوں سے جھٹک دیا گیا۔

"یہ ناپاک ہے ناپاک نجس۔ فحاشی اور بے حیائی کی پیداوار — مت چھوؤ۔ اپنے ایمان کی چادر کو آلودہ مت کرو۔"

صبح کی خنکی اُس کے ننگے بدن میں نیلاہٹ کو پھیلا رہی تھی اور ایک ہاتھ نے اُسے ڈھانپنا چاہا اور اُس کو بھی شکنجے میں کس کر اُٹھا لیا گیا" مت چھوؤ....."

تب متولّی ایک گہری پاکیزہ سوچ میں ہوا، سَر جھکایا اور احکامِ خداوندی کا طالب ہوا۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا، اپنے ماتھے پر ثبت مقدس نشان پر ہاتھ پھیرا اور نہایت نرم اور شفیق لہجے میں بولا "اس کی نجاست سے یہ مقدس صحن بھی نجس ہو گیا ہے اِسے پھر سے پاک کرنا ہو گا۔ احکام یہ ہیں کہ —" تب اُس نے اپنے لبادے میں پوشیدہ دونوں ہاتھ باہر نکالے اور فضا میں بلند کر دیئے۔ اُن میں پاکیزگی کے پتھر تھے۔ پہلا پتھر اُس نے خود مارا — بطنِ مادر سے باہر پہلی صبح اور پہلا پتھر — اور بیشتر عبادت گذار اُس پر جُھک گئے اور اُن کے ہاتھوں میں پتھر تھے کہ خدائی احکام یہی تھے — اور ابنِ مریم نے حیرت سے دیکھا کہ عبادت گذار اُس پر جھکے ہوئے

ہیں اور ان کے ہاتھوں میں پتھر ہیں اور ہر پتھر کے بعد اُن کے مقدس چہروں پر سُرخ چھینٹے پڑتے ہیں اور وہ ایک سرشاری کے عالم میں پھر پتھر اٹھاتے ہیں اور گوشت کے نرم ملغوبے کی طرف تاک کر پھینکتے ہیں اور کئیوں کا نشانہ چوک بھی جاتا ہے کہ وہ ناپاک ہدف بہت چھوٹا ہے اور یہ تعیّن کرنا بھی دشوار ہو رہا ہے کہ آخری پتھر کونسا ہو کیونکہ اُنہیں علم ہی نہیں کہ وہ تو پہلے پتھر کے بعد ہی واپس آسمانوں کو جا چکا تھا۔ البتہ عبادت گذاروں کے چہرے سُرخ چھینٹوں سے سُرخ ہو گئے، وہ سُرخرو ہو گئے۔ پوٹلی جو سفید تھی اَب خون سے لتھڑی ہوئی تھی اور اس میں صرف ایک بڑا سا چیتھڑا رہ گیا تھا اور بالآخر اُسے بھی انتہائی کراہت سے گندگی کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا گیا جو عبادت خانے سے باہر تھا اور مقدس صحن پھر سے پاکیزہ ہو گیا اور اُس پر نور برسنے لگا۔ عبادت گذار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، متولی نے بکھرے ہوئے پتھروں کو چُنا اور ایک کونے میں سلیقے سے جوڑ دیا۔ ایک پتھر وہ بھول گیا۔ وہ پتھر غیر ملکی سیّاح نے اٹھایا، اُسے دیکھا، اُس پر سُرخی میں تھڑا ہوا قیمہ تھا اور چند ذرّے تھے، گلابی رنگ کے، ابنِ مریم کی رنگت کے — وہ بیہوش ہو گیا۔

ہاں میں نے دیکھا۔

لیکن ہانڈ کی یہ داستان جیکل نہیں سُن رہا تھا، وہ ٹائم مشین کے ٹکڑے کو ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔" ہانڈ تم جھوٹ بول رہے ہو بوڑھے بکرے۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں پندرھویں صدی کے پُراسرار مشرق سے ہو کر آیا ہوں"۔ ہانڈ ناراض ہو گیا۔

جیکل نے لوہے کا ٹکڑا اُس کے آگے رکھ دیا۔" یہ ٹائم مشین کا ڈائل ہے میں نے غلطی سے پندرھویں صدی کی بجائے بیسویں صدی کا بٹن ہی دبا دیا تھا — تم تو آج اِنہی زمانوں میں اُس خطّے کو دیکھ کر آئے ہو —"

"کیا اِن زمانوں میں یہ — ہو سکتا ہے؟" ہانڈ نے اس کے آگے خون آلود پتھر رکھ دیا اور پتھر پر سُرخی سے تھڑا ہوا قیمہ تھا اور چند ذرّے تھے، گلابی رنگ کے، ابنِ مریم کی رنگت کے۔

ڈائری ۸۳ء

پہلا دن

فقیر آتا ہے، صدا دیتا ہے، چلا جاتا ہے، پتہ نہیں کیا صدا دیتا ہے، کہاں سے آتا ہے، کہاں چلا جاتا ہے لیکن فقیر ہے اور صدا دیتا ہے۔

جمعرات ہو تو دس پیسے فی فقیر کے حساب سے اپنے رزقِ حلال سے نکالتا ہوں۔ محتاجوں، بیواؤں، یتیموں اور فقیروں کو خیرات دیتا ہوں۔ کر بھلا سو ہو بھلا۔ لیکن اس فقیر کو کچھ نہیں دے پاتا۔ کیونکہ وہ آتا ہے، صدا دیتا ہے، چلا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیا صدا دیتا ہے، کہاں سے آتا ہے، کہاں چلا جاتا ہے، لیکن فقیر ہے اور صدا دیتا ہے۔ پتہ نہیں کیا کہتا ہے۔ کون سی زبان میں کہتا ہے۔ اللہ رسولؐ کا نام لیتا ہے اور ان کے آگے پیچھے پتہ نہیں کیا؟ "بھالو بھالو" وغیرہ کہتا ہے۔ فقیر ہے ظاہر ہے مانگتا ہی ہوگا۔ اور ان دنوں رزقِ حلال میں بھی کچھ کمی ہو رہی ہے۔ کہیں دھماکہ ہو جائے۔ گولی چل جائے تو رزق بھی حرام ہو جاتا ہے۔ ٹیئر گیس اس کی آنکھوں میں پڑ جائے تو اسے دکھائی نہیں دیتا اور دکھائی نہ دے تو میری جانب کیونکر آئے اور اب اگر میری جانب نہ آئے تو میں اسے خیرات کیسے کروں... اور خاص طور پر اس فقیر کی صدا ہی میری سمجھ میں نہیں آتی جو صدا دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

اس کی صورت شکل ہم جیسی نہیں ہے۔ ہم تو ماشاءاللہ دراز قد کھلی ہوئی رنگت اور فراخ سینوں کے مالک ہیں۔ لیکن وہ یونہی سا ہے۔ چھوٹے قد کا، نیم سیاہ، فاقہ زدہ اور چیکٹی داڑھی والا، ہماری طرح خوش لباس بھی نہیں پھٹی ہوئی چارخانی دھوتی اور پاؤں سے ننگا۔ ہاتھ میں چھتری بھی ضرور رکھتا ہے۔ آسمان کی جانب دیکھتا ہے۔ جیسے ابھی بارش ہونے کو ہو۔ حالانکہ حماقت ہے۔ ہمارے ہاں اتنی بارش تو نہیں ہوتی۔ ہاں اس کی آنکھوں میں سازش ہے لیکن اللہ رسولؐ کا نام لیتا ہے۔

تیسرا دن

لیجئے وہ فقیر پہچانا گیا۔

اپنے خواجہ صاحب آج اپنی بے پناہ معروفیات میں سے وقت نکال کر مجھ غریب کو ملنے کے لئے تشریف لے آئے، کل ہی جاپان سے لوٹے ہیں۔ ۷۱ء سے پہلے خواجہ صاحب کا سابقہ مشرقی پاکستان میں بڑا وسیع کاروبار تھا۔ پھر وطن اور اسلام دشمنوں نے تخریب کاری سے وطنِ پاک کا وہ بازو الگ کر دیا تو وہ ادھر چلے آئے۔ آئے دو کپڑوں میں تھے اب کپڑوں کی ملوں کے مالک ہیں، ہاں تو خواجہ صاحب تشریف لے آئے اور اسی وقت وہ فقیر بھی آگیا۔ اُس نے صدا دی تو خواجہ صاحب چونکے۔ اُسے پاس بلایا، بٹھایا اور گفتگو کرنے لگے اور اُسی غیر مانوس "بھالو بھالو" زبان میں جس میں وہ صدا دیتا تھا۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ یہ فقیر بنگالی ہے۔ ملک دو لخت ہوا تو ادھر بنگالیوں کی فہرستیں بنیں۔ یہ فقیر کسی درگاہ میں پڑا رہتا تھا۔ اس کا نام کون شامل کرتا۔ چنانچہ یہیں رہ گیا۔ اب زبان اسے نہیں آتی اس لئے بنگالی میں ہی صدا دیتا ہے جو کسی کو سمجھ نہیں آتی چنانچہ اکثر بھوکا رہتا ہے۔ پوچھو کہ بنگالی ہو تو پیٹ پر ہاتھ مارتا ہے کہ بھوک لگی ہے۔ مجھے ایک تو اس کی زبان سے اندازہ ہوا کہ بنگالی ہے.... اور دوسرے اس کی آنکھوں سے جن میں سازش کی چمک ہے۔

سبھی بنگالی ایسے ہی تھے۔ شکر ہے اُن سے جان چھوٹی اور پھر کوئی اتنے مسلمان بھی نہیں تھے۔ میں نے وہاں مولویوں کے گھروں میں بھی ہارمونیم دیکھے تھے۔ جتنا عرصہ وہاں قیام رہا مجال ہے کسی بنگالی کو پاس بھی بیٹھنے دیا ہو۔ مجھے تو گھن آتی تھی اُن سے۔ میں نے پوچھا خواجہ صاحب اگر گھن آتی تھی تو غلاظت کی اس پوٹلی کو اب کیوں پہلو میں بٹھا رکھا ہے۔ وہ بولے بھئی کبھی یہ ہمارے بھائی ہوتے تھے۔ دیکھ کر جی بھر آیا۔ وہ فقیر جانے لگا تو خواجہ صاحب نے اُس کی ہتھیلی پر ایک اٹھنی رکھ دی۔ اور گلوگیر ہو کر کہنے لگے۔ آہا۔ یہ فقیر متحدہ پاکستان کی آخری نشانی ہے۔ اب بھی بھالو بھالو کرتا ہے۔ ویسے ان لوگوں نے ہمارے ساتھ جو غداری کی اُسے کون بھلا سکتا ہے۔ فقیر نے سکّے کو غور سے دیکھا اور شاید اُس پر لکھی ہوئی بنگالی عبارت پڑھ کر خوش ہوا کیونکہ اس زبان کو پڑھنے والا شاید وہی واحد شخص اس ملک میں باقی تھا۔ اور پھر اسی زبان میں صدا دیتا ہوا چلا گیا۔

ساتواں دن

وہ فقیر اب بھی آتا ہے، صدا دیتا ہے، چلا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیا صدا دیتا ہے، کہاں سے آتا ہے، کہاں چلا جاتا ہے۔ لیکن فقیر ہے اور صدا دیتا ہے۔ اور...... اکیلا صدا نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور فقیر ہے جو صدا دیتا ہے۔ پتہ نہیں اس کے پیچھے کوئی اور فقیر ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ میرا واہمہ ہے جو میں دیکھتا ہوں لیکن مجھے دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی صدا صاف سنائی دیتی ہے یہ بھی کسی غیر مانوس زبان میں صدا دیتا ہے۔ بیچ میں اللہ رسولؐ کا نام بھی آتا ہے۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا ہے اور وہ سب یہی کہتے ہیں کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ فقیر تو اب بھی ایک ہی آتا ہے۔ صدا دیتا ہے اور چلا جاتا ہے لیکن مجھے تو دوسرا فقیر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی صدا سنائی دیتی ہے۔ فضا میں ہوائیں چلتی ہیں سائیں سائیں کرتی ہوئیں۔ یا شاید سائیں سائیں کرتی ہوئیں۔ میں کیا کروں۔ مجھے دوسرا فقیر بھی دکھائی دیتا ہے۔